مجلہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر ہوا

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)
25 بی گلبرگ- 2 لاہور 54660
ٹیلی فون : 876219
فیکس : 92-42-876219

انتظامیہ ادارہ طلوع اسلام
چیئرمین:- ایاز حسین انصاری
ناظم:- محمد لطیف چوہدری

مدیر مسئول:- محمد لطیف چوہدری
مجلس ادارت:- میجر محمد یوسف ڈار- محمد عمر دراز
ناشر:- عطاء الرحمٰن ارائیں
طابع:- خالد منصور نسیم
مطبع:- النور پرنٹرز و پبلشرز
3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور- 54500

مقام اشاعت:- B-25 گلبرگ 2 - لاہور- 54660

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ	2
پاکستان اور دین اور سیاست	محمد حنیف رامے	5
ضمیر	عبداللہ ثانی	36
قرآنی معاشرہ میں جرم، مجرم، سزا اور اسلامی ریاست کا باہمی تعلق	حبیب الرحمان خان	45
شاہکار رسالت مابؐ (حضرت عمر فاروقؓ)	محمد عمر دراز	51
مسلمانوں میں علمی تحریک	صابر صدیقی	56
ولن الکافرین لا مولی لھم	ایم بشیر احمد	64
کلچر	منظور احمد (ناروے)	71
حقائق و عبر	ادارہ	75
مرد خود آگاہ - علامہ غلام احمد پرویزؒ	ادارہ	76
A FEED BACK To: Islam The Only Way	مس شمیم انور	80

جلد 48 شمارہ 7 جولائی 1995ء

بدل اشتراک
اندرون ملک سالانہ 120 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ 550 روپے
آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا 750 روپے

فی پرچہ =/10 روپے

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جاگ اٹھا کشمیر

کشمیر کا مسئلہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ پاکستان اس کے بغیر نامکمل اور' نیم جان ہے۔ اس کا الحاق پاکستان سے نہ ہوا تو پاکستان کی زندگی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ یہ الفاظ زبان و قلم سے ہر روز دہرائے جاتے ہیں لیکن ان الفاظ کی معنویت پر ایمان کا یہ حال ہے کہ پچھلے اڑتالیس سال سے یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے سرد خانے میں پڑا ہوا ہے اور ہم محض بیانات جاری کرنے پر اکتفا کئے ہوئے ہیں۔ ان اڑتالیس سالوں میں ماسوائے اس کے کہ ہم نے ہندوستان سے استصواب رائے کے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کروا لئے' کوئی ایک قدم بھی ایسا نہیں اٹھایا جس سے مثبت نتائج سامنے آتے۔ الٹا ہم نے جنگ بندی پر اتفاق کر کے ہندوستان کو مہلت دے دی کہ وہ عسکری طور پر کشمیر میں قدم جمائے اور اطمینان سے ریاست کو ہضم کر لے۔ آج کشمیر ہندوستان میں مدغم ہی نہیں ہو چکا بلکہ آبادی کے اعتبار سے بھی ہندو بنتا چلا جا رہا ہے۔ جموں کا صوبہ تو تقسیم کے فوراً بعد ہی مسلمانوں کے قتل عام کے ذریعے ہندو بنا لیا گیا تھا' اب باقی علاقوں میں بھی ہندوستان سے غیر مسلم لا لا کر آباد کئے جا رہے ہیں اور انہیں طرح طرح کی مراعات دیکر ریاست کا شہری قرار دیا جا رہا ہے۔ کشمیر کی مسلمان آبادی کو ہندو آبادی میں بدلنے کی تحریک اسقدر زور پکڑ چکی ہے کہ وہاں کے مقامی باشندے اس درد سے چیخ اٹھے ہیں۔ وادی کشمیر کے مظلوم و مقہور مسلمان' غلامانہ زندگی پر تو بامر مجبوری زہر کے گھونٹ پی کر' قناعت کر سکتے تھے لیکن وہ یہ کیسے گوارا کر لیں کہ ان کی آبائی سرزمین پر' ان کا اور ان کی اولاد کا جینا محال ہو جائے۔

کشمیر کے بارے میں پاکستان میں جو قلبی جذبات پائے جاتے ہیں' وہ محتاج تشریح نہیں۔ یہ خطہ پاکستان کا لاینفک جز ہے۔ جس طرح اس کے بغیر پاکستان کا نام مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس خطے کے بغیر ہمارا ملک مکمل نہیں ہوتا۔ یہ فیصلہ تنہا جغرافیہ ہی کا نہیں بلکہ تاریخ' روایات' ثقافت' مذہب سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوتے ہی مجاہدین' کشمیریوں کی مدد کو پہنچے۔ یہ مدد اتنی موثر ثابت ہوئی کہ ڈوگرہ حکمران سرینگر سے بھاگ کر دہلی جا پہنچا۔ کشمیر کا فیصلہ تقریباً ہو چکا تھا کہ یہ سلسلہ سیاست کے گرداب میں پھنس گیا۔ پھر کیا تھا' جو کام ہندوستانی توپوں سے نہ ہو سکا وہ مذاکرات کی میزوں پر باتوں باتوں میں ہو گیا۔ کشمیر میں بظاہر جنگ بند ہو گئی اور امن قائم ہو گیا۔ لیکن اس دن سے یہ خطہ جنت نظیر' جہنم میں تبدیل ہو گیا۔ بیچارگان کشمیر "بیچارہ تر" ہو گئے۔ کیونکہ اس طرح وہ دوستوں اور بھائیوں کی مدد سے محروم ہو کر بھارتی

سنگینوں میں گھر گئے۔ وہ دن اور آج کا دن کشمیری غلامی کے شکنجے کستے چلے جا رہے ہیں۔

یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس کے متعلق ہر پاکستانی ایک ہی رائے رکھتا ہے اور وہ یہ کہ جتنی جلد اور جس طرح بھی ہو سکے کشمیر کو ہندوستان کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرایا جائے۔ اس لئے نہ کسی صلاح و مشورے کی ضرورت باقی ہے نہ اتفاق رائے کی۔ حکومت کو چاہئے کہ سیاسی مصلحت کوشیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک متعین لائحہ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جائے' کیونکہ اب صورت حال اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ یک دن کی تاخیر بھی کشمیر اور پاکستان دونوں کے لئے انتہائی ناخوشگوار نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔

حکومت کی گومگو اور لیت و لعل کا نتیجہ ہے کہ قوم میں بے صبری پیدا ہو گئی ہے اور ایسے افراد ابھرنا شروع ہو گئے' میں جو اپنی بساط کے مطابق کچھ کر گذرنا چاہتے ہیں۔ ان کی قربانی کا جو بھی نتیجہ نکلے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کشمیر کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہیں موقع ملے تو وہ کشمیر کے لالہ زاروں کو اپنے خون سے رنگنے سے دریغ نہیں کریں گے' لیکن یہ موقع بہم پہنچانا حکومت کا کام ہے۔ حکومت کی خوش قسمتی ہے کہ اتنے نازک معاملہ میں بھی پوری قوم' اپنے تمام اختلافات بھول کر' اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ یہ ایسے قرائن ہیں جن سے حکومت کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔ حکومت نے کم سے کم وقت میں کشمیر پالیسی متعین کر کے قیادت کا فرض ادا نہ کیا تو وقت ہاتھ سے نکل جائیگا۔ ایسے نازک موقع پر ہم حکومت وقت کے علم میں لانا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ تو ہندوستان اور اقوام متحدہ کا منہ دیکھ سکتی ہے لیکن قوم میں اتنا صبر نہیں کہ اطمینان سے بیٹھ سکے۔ انہیں مظلومین کشمیر کی آہیں پکار رہی ہیں اور اب قوم یہ سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں کہ "ہمالہ کے چشمے کب ابلتے ہیں" اس کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے اور ایسا مقام آپہنچا ہے جہاں موت زندگی سے بھی زندہ تر ہو جاتی ہے۔ ان آثار حیات کو جذباتی سمجھنے والے جان لیں کہ۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند و جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک سرکاری اعلان کے مطابق وزیراعظم پاکستان نے کشمیر کمیٹی کے چیئرمین کے مشورہ پر کشمیر فنڈ قائم کر کے تمام پاکستانیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ دل کھول کر اس فنڈ میں عطیات دیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ فنڈ مقبوضہ کشمیر میں ظلم کے خلاف مہم پر خرچ کیا جائیگا۔ وابستگان فکر قرآنی سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس فنڈ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ دیار غیر میں مقیم پاکستانی' اس فنڈ کے لئے اپنے عطیات ادارہ طلوع اسلام کی معرفت بھجوا سکتے ہیں۔

2- عوامی بجٹ؟

1995ء کا عوامی بجٹ بھی غریب عوام کے لئے کوئی خوشخبری نہیں لایا۔ لگتا ہے حکومت نے یہ طے کر لیا گیا ہے کہ اس ملک میں عوام حکومت کے لئے ہیں' حکومت عوام کے لئے نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وزیر خزانہ' جو تخمینہ سب سے پہلے پیش کرتے' وہ یہ ہوتا کہ موجودہ حالات میں پاکستان کے ایک شہری کو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے کم سے کم کتنی رقم درکار ہے اور اس رقم کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لئے حکومت نے کیا اہتمام کیا ہے۔ اس میں اگر یہ بھی باور کر لیا جاتا کہ یہ ملک اسلامی ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کے تتبع میں یہ تخمینہ سربراہ مملکت کے اپنے گھر کا ہوتا۔ ہماری وزیراعظم اتفاق سے خاتون خانہ بھی ہیں۔ خاوند' بیوی اور تین بچوں پر مشتمل ان کا کنبہ ملک کا ایک اوسط گھرانہ ہے۔ لہٰذا ان سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ کسی ملازم کے گھر کا کم از کم اوسط خرچ کیا ہونا چاہئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے ایسا نہیں سوچا ہو گا' خاص طور پر جبکہ وہ سربراہ حکومت ہونے کے علاوہ ایک شفیق ماں بھی ہیں' لیکن ان سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ براہ کرم ایک بجٹ کسی غریب سے غریب گھر کا بھی بنوا دیں اور یہ بھی بتا دیں کہ غریب اپنے گھر کے اس بجٹ کا خسارہ کس کی جیب کاٹ کر پورا کریں اور اگر ہو سکے تو اپنی والدہ ماجدہ سے یہ پوچھ کر بھی بتا دیں کہ ایک بوڑھا آدمی کتنے پیسوں میں زندہ رہ سکتا ہے تاکہ پنشنروں کا احساس محرومی بھی ختم ہو جائے جو بجٹ تقریر سن کر ان پر بجلی بن کر گرا ہے۔

عوام کو بجٹ سے اگر دلچسپی کوئی تھی تو صرف اس قدر کہ بجٹ کے بعد ان کے گھر کا چولہا جلے گا یا نہیں۔ ملازمین اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وزیروں' مشیروں اور درباریوں کے ساتھ حکومت کے فیاضانہ رویئے کے کچھ چھینٹے ان پر بھی پڑیں گے۔ پنشنر یہ تاک لگائے بیٹھے تھے کہ پچھلے سال حکومت کا ہاتھ تنگ تھا' اس سال تو بقول وزیر خزانہ ملک نے ریکارڈ ترقی کی ہے' ہو سکتا ہے حکومت وقت کو اپنے ان بزرگوں کی حالت زار پر بھی ترس آجائے' لیکن افسوس کہ ان کی دلجوئی اس سال بھی نہ ہوئی۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم حکومت وقت کو کیسے سمجھائیں کہ عوام کو "فیصد" نہیں "روٹی" چاہئے۔ روٹی کا تخمینہ لگانے کے لئے نہ اقتصادیات کے جگادھری درکار ہیں' نہ IMF کے ماہرین۔ روٹی تو صدر مملکت کے گھر میں بھی پکتی ہو گی اور وزیر اعظم کے گھر میں بھی۔ روٹی کا بھاؤ تو وزیر خزانہ کی بیگم کو بھی معلوم ہو گا اور سیکرٹری خزانہ کی اہلیہ کو بھی۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ وزارت خزانہ ایک فرد کی کم سے کم ضروریات پر مبنی ایک اوسط گھر کا بجٹ تیار کرے اور اس رقم کو ہر پاکستانی شہری کی بنیادی ضرورت قرار دے۔ ہر سال بجٹ سے پہلے اس بنیادی بجٹ کو Up Date کر کے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ آنے والے بجٹ سے عوام کی بنیادی ضروریات کسی قیمت پر متاثر نہ ہونے پائیں۔ اگر یہ نہیں تو سب شرار بولہبی ہے' جو زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ خدا را! اس وقت کا انتظار نہ کیجئے جب پاکستان کے غریب عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

قند مکرر

پاکستان اور دین اور سیاست

جناب محمد حنیف رامے
(سپیکر پنجاب اسمبلی)

موقر ماہنامہ نصرت (لاہور) کے مدیر جناب محمد حنیف رامے صاحب نے پرویزؒ صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو لیا تھا جس کی روئیداد انہوں نے اپنے جریدہ میں شائع کرنے کے لئے مرتب کی تھی۔ جس کی ایک کاپی انہوں نے ہمیں بھی مرحمت فرمائی تھی۔ جو ان کے شکریہ کے ساتھ' طلوع اسلام کے جنوری 66ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ موضوع کی افادیت کے پیش نظر ہم اس مضمون کو دوبارہ قارئین کے سامنے لانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (مدیر طلوع اسلام)

حنیف۔ اگر کسی کو یہ یادگار نعرہ بھول نہیں گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا "لا الٰہ الا اللہ" تو وہ شاید انکار نہ کر سکے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ لیکن پچھلے سترہ سال میں کئی مرتبہ یہ کوشش ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ کبھی کسی بڑے مصنف نے حکم لگایا کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا' ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی' معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کبھی کسی بڑے وکیل نے ثبوت مہیا کیا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں اسلامی قوانین کے تعین پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو ایک کے نزدیک معروف ہے وہ دوسرے کے لئے منکر ہے۔ اس طرح ہم میں اندر ہی اندر ایک منافقت پرورش پاتی رہی' جس کے تحت ہم نہ تو اسلام کا نام لینا چھوڑ سکے اور نہ ہم نے اس کی روشنی میں اپنی سیاسی' معاشرتی اور معاشی راہیں تراشنے کی سبیل کی۔ پھر ایک دن آیا کہ ملک کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑ گیا۔ منافقانہ اسلامیت سے یہ علانیہ غیر اسلامیت بہتر تھی۔ لیکن جن عوام کو ساتھ ملانے کے لئے خواص نے ایک مرتبہ اسلام کا نام لیا تھا وہ ابھی اس واقعے کو نہ بھولے تھے بلکہ برسوں کی سیاسی

بیوست' معاشرتی ہلچل اور معاشی استحصال کو وہ اسی امید پر برداشت کرتے آئے تھے کہ کبھی تو اس مملکت خداداد پر اس قانون کی حکومت کے دن آئیں گے جس کا اسوہ نبی کریمؐ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے ضد کی اور اسلامیہ کا لفظ اس ملک کے نام میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

اب پچھلے دنوں ہم نے ایک انقلاب آتے دیکھا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف تو آفاق پر دشمن کی یلغار تھی اور دوسری جانب انفس میں خدا جاگ رہا تھا۔ وہ خدا جو نیٹشے کے الفاظ میں مرچکا تھا' ہمارے دل و دماغ کے گردبادوں سے ابھر کر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہم نے اور ہمارے لشکروں نے باقاعدہ خدائے ذوالجلال کے زیر کمان اپنے غنیم سے ٹکر لی اور جرات و جواں مردی کے تازہ و تابندہ باب لکھے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہمارے اندھوں کو بھی انسانی معاملات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین آچکا ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ایک لمحے کو خواب خرگوش سے بیدار ہونے والی قوم ایک مرتبہ پھر چونک کر کروٹ بدل چکی ہے۔ اگر ہم نے اس لمحہ بصیرت کو پہلے کی طرح ضائع کر دیا تو یہ اپنے ساتھ ظلم ہو گا۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست' معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اس در پر اور کبھی اس در پر' اور کبھی اس چیز کی اور کبھی اس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ' ہمہ وسعت ومعانی' اس کے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لئے خدا کی وحدت آفرین رسی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہم کنار رکھتی ہیں۔

پرویز۔ حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دور حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرن اول میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے' ان کا ایک نظام تھا' سب کے لئے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہو گئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے بالفاظ صریح شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام

مسلمانوں کے لئے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔۔۔۔ یعنی ایک ایسا ضابطہ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لئے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لئے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطہ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین ارباب حکومت کے سپرد کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) ارباب مذہب کی تفویض میں دیدیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں۔ اس سے ارباب حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور ارباب مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا "اسلام" الگ الگ ہو گیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (SECULAR FORM) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامت دین قرار دیدیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لئے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا، جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلامی) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عائد کر دیئے گئے ہیں۔ ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابل فہم ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کی باتیں قوم کے دانشمند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے (1930ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

> مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہو گا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائیگی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر

حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرمؐ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سر نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بیں نگاہوں اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لئے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خاردار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے۔ لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی۔ سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آجایا کرتا تھا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے' دین خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو' جس میں دین خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے' محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظام حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیات اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے' یہی ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اگر خدا کی اس کتاب عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہد نبی اکرمؐ میں وجہ سرفرازی انسانیت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لئے ایک ایسے جرات مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لئے ہوئے اٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ

حسبنا کتاب اللہ۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی تھا وہ اجمال جس کی تفصیل قائداعظمؒ نے (1941ء میں عثمانیہ یونیورسٹی' حیدر آباد دکن کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں) ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ

> "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے' جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً" نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی

حکمرانی ہے..... اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو"۔

قرآن کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام کے جن کا تعلق بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے ہے) زندگی کے مختلف تقاضوں کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امت مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں' باہمی مشاورت سے' جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس طرح اس امت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن پکڑے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو گا اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی"۔

قرآن کریم کا یہ انداز اس طریق کے عین مطابق ہے جسے آج کل سائنٹیفک طریق کہا جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سائنسٹ تجرباتی طریق سے قوانین مرتب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ سائنسٹ قوانین فطرت مرتب نہیں کرتے' فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے متعلق' جنہیں اساسی قوانین (AXIOMS) کہا جاتا ہے سائنسٹ یہ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کس طرح دریافت ہوئے تھے۔ سائنس ان قوانین کو بطور حقیقت ثابتہ تسلیم کر کے انہیں اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتی ہے اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش آمدہ حالات پر منطبق کرتی ہے۔ سائنس کا تعلق خارجی کائنات سے ہے اور دین کا تعلق انسان

کی ہیئت اجتماعیہ سے۔ جن قوانین کو سائنس کی دنیا میں (AXIOMS) کہا جاتا ہے' دین کے نظام میں وہ مستقل اقدار یا وحی کے عطا کردہ اساسی اصول کہلاتے ہیں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ یہ تھا اسلام کا وہ بنیادی تصور جسے عملی پیکر عطا کرنے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے میری یہی کوشش رہی کہ مملکت کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے ایک طرف حکومت کا سیکولر انداز بھی ختم ہو جاتا تھا اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا وہ اقتدار بھی باقی نہ رہتا تھا جو اسے شخصی قوانین کے دائرے میں اس وقت حاصل ہے' اس لئے میری دعوت کی مخالفت دونوں طرف سے ہوئی۔ سیکولر نظام کے حامی تو کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے لیکن مذہبی پیشوائیت کے لئے میدان وسیع تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ تو نہیں کہا (نہ ہی وہ ایسا کہنے کی جرات اپنے اندر پاتے تھے) کہ قرآن کی آمد سے ان کی تھیاکریسی ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے نازک جذبات کا سہارا لے کر یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ انکار سنت ہے' یہ (معاذ اللہ) انکار رسالت ہے۔ میں اس مقام پر اقرار و انکار سنت کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ ہمارے پیش نظر موضوع سے متعلق نہیں' لیکن اتنی بات تو حنیف صاحب! بادنیٰ تدبر واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا یہی نقشہ تھا کہ مملکت میں پبلک لاز الگ ہوں اور پرسنل لاز الگ۔ پبلک لاز حکومت کے زیر اقتدار ہوں اور پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں۔۔۔۔۔ اور پھر پرسنل لاز میں ہر فرقے کا مسلک الگ الگ ہو اور اس طرح امت کے تفرقے کو مستقل سند حاصل رہے۔ اسلام کا یہ نقشہ ان حضرات کے نزدیک عین مطابق سنت ہے اور یہ نقشہ کہ قوانین میں کسی قسم کی تفریق نہ ہو' سب کا سرچشمہ خدا کی کتاب ہو اور یہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں منطبق ہوں تاکہ امت کا تفرقہ اور انتشار ختم ہو کر اس میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے ان کے نزدیک خلاف سنت ہے' اور اس کا نام انکار رسالت ہے۔ فرمایئے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے!

بہرحال ان مخالفتوں کے علی الرغم میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ ہمارے ہاں یہ اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن کریم پر ہو گی جو تمام فرقوں کے مسلمانوں میں قدر مشترک ہے۔ جب 1962ء کے آئین کی ترتیب کا سوال زیر غور تھا تو حکومت کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس اصول پر خاص زور دیا تھا۔ لیکن جب آئین مرتب ہو کر سامنے آیا تو اس میں "قرآن" کی بجائے "اسلام" کا لفظ لکھا

تھا۔ تھیاکریسی کے حامیوں نے اسے بعد میں "کتاب و سنت" کے الفاظ میں بدلوا لیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جس منافقت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ سیکولر نظام حکومت کے حامی دل میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ "اسلام" ہو یا "کتاب و سنت" اس سے قیامت تک کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور سے ہو سکے۔ (اس لئے کہ "اسلام" کی طرح "سنت" کا مفہوم بھی ہر فرقے میں الگ الگ ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اتباع سنت کے مدعی حضرات آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا مطابق سنت ہے یا خفی آواز سے۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ اس مسلک کی رو سے کبھی یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکے جو ان تمام حضرات کے نزدیک یکساں طور پر قابل تسلیم ہو؟) لہٰذا یہ طبقہ مطمئن ہے کہ نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے نہ مملکت اسلامی بنے گی۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس طرح ایسا ضابطہ قوانین تا حشر مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک "اسلامی" کہلا سکے۔ اس لئے ان کی فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے دائرے میں ان کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس سے دونوں گروہ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن سیکولر انداز کا حامی گروہ یہ کہہ چھوڑتا ہے کہ فرقوں کا اختلاف قانون سازی کی راہ میں حائل ہے اور مذہبی پیشوائیت یہ طعنہ دے چھوڑتی ہے کہ ارباب حکومت چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اور "اسلامی قوانین" سے ان کی مراد ہوتی ہے شراب' جوئے' ریس اور زنا کی ممانعت یا عورتوں کی بے حجابی یا مردوں کے کلب اور جیم خانے وغیرہ پر بندش۔ یعنی وہ اخلاقی برائیاں جن کے بارے میں ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔ لیکن جن امور میں ان حضرات میں باہمی اختلاف ہے ان کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔ ان سے پوچھئے کہ یہ اخلاقی برائیاں قرآن کریم کی رو سے جرائم ہیں لیکن فرقہ بندی' اس کی نص صریح کے مطابق شرک ہے۔ آپ جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی پر تو اس قدر زور دیتے ہیں' لیکن اس شرک کو ختم کرنے کے لئے آپ کی طرف سے کبھی اشارہ تک نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی کوشش ہوتی ہے تو آپ حضرات اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کوشش کو ناکام بنائے بغیر چین نہیں لیتے۔ مثلاً 1962ء کے آئین میں پرسنل لاز کے متعلق مختلف فرقوں کے الگ الگ قوانین کے تصور کو ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے آئین کی اس شق کو بدلوا کر' اس کی جگہ فرقہ وارانہ تعمیر کی شق داخل کرا لی۔

گذشتہ ستمبر کے قیامت خیز ہنگامے میں ہماری قوم کے دل میں جو بے پناہ جذبہ بیدار ہوا ہے اور اس

نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے ہیں' وہ نتیجہ ہیں اسلام کے ساتھ اس گہرے لگاؤ کا جو ہمارے عوام کے تحت الشعور میں خوابیدہ چلا آرہا ہے اور جو اس قسم کے تصادمات کے وقت یک دم بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ متاع بیش بہا ہے اور اسے عمدہ تعمیری مقاصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر جو سوال ہے اس کا تعلق جذبات سے نہیں' علم و بصیرت اور تفقہ و تدبر سے ہے۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ پاکستان میں وہ نظام زندگی کس طرح متشکل کیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا؟ اور ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہمارے عوام کے یہ جذبات بھی اس سے پہلے ضائع جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی متعین مقصد نہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ عوام بچارے نہایت خلوص نیت سے یہ قربانیاں "اسلام" کی خاطر دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ابھی تک یہی متعین نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے' ہمارے ہاں ہر ذہن میں اسلام کا الگ مفہوم ہے۔ عوام کی اسلام کے ساتھ یہ محبت ایک نادیدہ محبوب کے ساتھ عشق کے مترادف ہے۔ یعنی اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری قوم کی کیفیت یہ ہے ——— دلے دارد و محبوبے ندارد۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ جذبہ لاشعوری طور پر کام کرتا ہے قوم بے پناہ قربانیاں دیتی چلی جاتی ہے اور جب وہ اس پر شعوری طور پر نگہ باز گشت ڈالتی ہے اور اپنے گردو پیش دیکھتی ہے تو اسے کچھ اور ہی نظر آتا ہے اور یوں ان کا وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کا رد عمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ عوام کے اس قیمتی جذبے کو مستقل شعار بنانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم متعین کر کے اسے عملی نظام کی شکل میں متشکل کیا جائے جس کے حسین و خوشگوار نتائج اسے ان کی نگاہوں میں دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز بنا دیں اور یوں وہ اس کے تحفظ و بقا کی خاطر ہر قربانی کے لئے نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ علی وجہ البصیرت ہر وقت تیار ہوں۔

باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا' ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی' معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا' تو ان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ اس سے تحریک پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائداعظمؒ کے دشمنوں تک نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرات کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ "منافق" تھا ——— اور منافق بھی ایسا جو حصول مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا' اسے (Exploit) کر رہا تھا۔ جدوجہد آزادی کے دس سالہ دور میں قائداعظمؒ کی تقاریر' تحریرات' بیانات' خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ

اس مطالبے کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو برنائے مذہب۔ ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں تو اس لئے کہ

"ہم اس میں اپنے ضابطہ حیات' ثقافتی نشوونما' روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"۔

وہ واضح طور پر بتاتے رہے کہ :

"پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی' ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"۔

جب پوچھا جاتا کہ تشکیل پاکستان سے ہو گا کیا تو وہ جواب میں کہتے :

"اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گذشتہ کو از سر نو زندہ کرے گی"۔

آپ کو غالباً" یاد ہو گا کہ ایک دفعہ (1941ء) میں مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ سیاست میں مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہیں' تو اس کے جواب میں انہوں نے برملا کہا تھا کہ :

"میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو' مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا رہ کیا جاتا ہے !"۔

قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی امتیاز کے متعلق جو کچھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں بتایا تھا اس کا ذکر ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

ہمارے یہ پاکستانی کرم فرما کہتے ہیں کہ جناح نے اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے چپکا رکھا تھا ورنہ اس کا مقصد کسی اسلامی مملکت کا قیام نہیں تھا۔ لیکن سنئے کہ اس زمانے کے ہندو کیا سمجھتے تھے۔ 1941ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا۔

"آپ کو کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیں ! نظریہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ

گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنا لیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہو گا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو"۔

ہندو تو قائداعظمؒ کے اسلامی نعرے کو حقیقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ہمارے یہ مسلمان بھائی اسے "دروغ مصلحت آمیز" سے تعبیر فرماتے ہیں!

پھر اس کا کیا جواب کہ جب پاکستان بن گیا اور (بقول معترضین) قائداعظمؒ کے پیش نظر وہ مصلحت یا ضرورت نہ رہی جس کے تابع وہ اپنی ہر بات کے ساتھ اسلام کا نام چپکائے رکھتے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی اسلام کا نام نہ چھوڑا۔ انہوں نے جولائی 1948ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اور (جو غالباً ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں انہوں نے کہا تھا:

"ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلامی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضے سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے جائے اور نوع انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا"۔

یہ تھی جناح کی آخری پکار جب اسے کسی 'مصلحت آمیزی' کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے شک مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی بہبود چاہتا تھا لیکن صرف قرآنی نظام کی رو سے' جس میں آج بھی یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہر اس قوم کو جو اسے اپنا مسلک زندگی قرار دے لے نہ صرف مادی سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے بلکہ شرف انسانیت کی معراج کبریٰ تک پہنچا دے--- "یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا"۔

حنیف— پرویز صاحب! آپ نے "نصرت" کے گذشتہ شماروں میں جناب منظور قادر سے میرا ایک انٹرویو دیکھا ہو گا۔ منظور قادر صاحب نے جس نقطہ نظر سے دین اور سیاست کے رشتے پر بات کی ہے وہ بظاہر آپ کے نقطہ نظر کے قریب قریب برعکس ہے۔ انہوں نے اسلام کے مروجہ تصورات کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی یا معاشرتی قالبوں میں ڈھالنے سے ہمارے ہاں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن کیا ان

کی یہ رائے آپ سے قریب نہیں کہ یہ فضا اسلام کے بارے میں مروجہ تصورات کی بناء پر ہے۔

پرویز۔ میں نے اس انٹرویو کی روئیداد "نصرت" میں دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس ہوا اور یہ اس لئے کہ میرے دل میں منظور قادر صاحب کی قانونی قابلیت کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک بلند پایہ وکیل ہیں اور مملکت پاکستان میں وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔ نیز مغربی پاکستان کی عدلیہ کے چیف جج بھی۔ ایک وکیل اور جج کی حیثیت سے مقدمات میں ان کے سامنے ہر قسم کا رطب دیا بس پیش ہوتا ہے' جھوٹے دعوے دائر کئے جاتے ہیں' جھوٹی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں اور انہیں اصلی اور سچی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ منظور قادر صاحب کا منصب یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور جعلی کو اصلی سے الگ کریں اور پھر پیش نظر مقدمے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچیں۔ مجھے افسوس اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے مقدمات تک میں تو وہ اس طریق کار کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے "اسلام کا مقدمہ" پیش ہوا تو انہوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جو باتیں اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کے سامنے پیش کی گئیں اسے انہوں نے عین اسلام قرار دیدیا اور پھر اس کے خلاف ڈگری صادر کر دی۔ انہوں نے خدا' رسول' وحی' عبادت' گناہ' ثواب' توبہ' صدقہ وغیرہ کے خلاف اپنے اعتراضات کی بنیاد ان باتوں پر رکھی جو' معاف فرمایئے' ہمارے ہاں داستاں سرا واعظوں اور قصہ گو خطیبوں کے یہاں یا پکی روٹی جیسی کتابوں میں لکھی ملتی ہیں۔

حنیف۔ پرویز صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد اسی اسلام سے واقف ہیں جو پکی روٹی اور واعظوں کے خطبوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اگر منظور قادر صاحب نے کہا ہے کہ اسلام کی مروجہ شکلیں اس لائق نہیں کہ ان سے وہ نتائج پیدا ہو سکیں جن کی ہمیں آرزو ہے تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ منظور قادر صاحب خود بھی اکثر مروجہ عقائد سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

پرویز۔ اگر منظور قادر صاحب یہ فرما دیتے کہ ان کے اعتراضات ان عقائد' تصورات اور رسومات کے خلاف ہیں جنہیں آج کل اسلام کے نام سے موسوم کر کے پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تنقید حق بجانب ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں کچھ نرم سی تصور کی جاتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ـــــ بالارادہ یا بلا ارادہ' وہ حقیقی اسلام کے بعض بنیادی تصورات تک کو بھی اپنی تنقید کی زد میں لے آئے ہیں اور اس تنقید کی بنیاد وہ عقائد و تصورات ہیں جو ہمارے ہاں بلا سند و تحقیق متوارث چلے آرہے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرمؐ کی تئیس سالہ زندگی میں جو جو واقعات سامنے

آئے قرآن نے ان کے متعلق ہدایت دی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اس تیئس سال کے عرصے میں محدود واقعات ہی سامنے آسکتے تھے' سب کے سب نہیں۔ نیز نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد واقعات کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا' ہر نئے دن نت نئے واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن میں دی ہوئی راہ نمائی اس زمانے کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی' یہ نہ تو ابدی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ایسی مکمل کہ گذشتہ' موجودہ اور آنے والے تمام واقعات و حوادث کو محیط ہو سکے۔ یہ تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور (جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے) مبنی ہے "شان نزول" کے نظریئے پر۔ لیکن اگر موصوف "مروجہ اسلام" سے قطع نظر کر کے خود قرآن کریم پر غور فرما لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ "شان نزول" کا نظریہ خود قرآنی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ قرآن کریم اس کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ یہ وہی دین ہے جسے خدا نے نوحؑ کو دیا' ابراہیمؑ کو دیا' موسیٰؑ کو دیا' عیسیٰؑ کو دیا' تمام سابقہ انبیاء (علیہم السلام) کو دیا۔ سو جو دین روز اول سے چلا آرہا تھا اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مجموعہ ہے ان ہدایات کا جو ان واقعات کے پیش نظر دی گئیں جو رسول اللہؐ کی زندگی میں اور اس معاشرے میں پیش آئے اور بس دین کی حقیقت سے بے گانگی کی دلیل ہے کہ اور پھر جس دین کے متعلق قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تمام نوع انسان کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو محیط نہیں ہو سکتا' قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔

قرآن کریم میں دی ہوئی ہدایات کے متعلق منظور قادر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ (Trial and Error) کے تجرباتی طریق کا نتیجہ تھیں' وحی کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ (Trial and Error) عقل انسانی کا طریق ہے جو مستقبل کا علم نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس وحی ہے جو عقل انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کا علم حدود فراموش ہے۔ لہٰذا اسے عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منظور قادر صاحب کے اس دعوے کی بنیاد "ناسخ و منسوخ" کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ عقیدہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ اس کے لئے بطور مثال انہوں نے شراب کی ممانعت سے متعلق قرآنی احکام پیش کر کے فرمایا کہ دیکھئے ! یہ احکام کس طرح بتدریج آئے ہیں جس سے ثابت ہوا ہے کہ یہ (Trial and Error) کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت اتنی فرصت نہیں کہ میں شان نزول یا ناسخ و منسوخ جیسے نظریات پر تفصیلی بحث کروں' نہ ہی اس کا تعلق آپ کے سوال سے ہے' البتہ ممانعت خمر سے متعلق احکام والی مثال کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تدریجی احکام (Trial and Error) کے استقرائی طریق کا نتیجہ نہیں تھے' اس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ افراد میں جو برائیاں اس

طرح زمیں گیر ہو چکی ہوں کہ ان کا ایک دم استیصال طبعی طور پر ناممکن ہو ان کی اصلاح بتدریج کرنی چاہئے۔ شراب جس شخص کی گھٹی میں پڑ چکی ہو اس کے لئے اس کا یک لخت چھوڑ دینا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس کی یہ عادت بتدریج چھڑانی چاہئے۔ یہ تھی مصلحت اس قسم کے احکام کو بتدریج نافذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں شراب کو بند کرنا ہو تو اس کے لئے قرآن کریم کا تجویز کردہ تدریجی طریق ہی اختیار کرنا ہو گا۔

حنیف۔ پرویز صاحب! مہربانی سے ذرا دو ایک مثالوں سے واضح کریں کہ قرآن حکیم اپنے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی' معاشرتی اور معاشی تقاضوں سے کیونکر عہدہ برا ہوتا ہے۔

پرویز۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے قرآن کریم کے ابدی اصول اس چار دیواری (Boundary Lines) کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر زمانے میں عملی پروگرام خود وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ (**وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ**) (5:44) "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں"۔ ان اصولی ہدایت کے پیش نظر ہمارا طریق کار یہ ہو گا کہ جو معاملہ ہمارے سامنے آئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس بابت میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس راہنمائی کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے یہ طے کیا جائے کہ اس معاملہ کے متعلق ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس باہمی مشورے کا طریق عمل کیا ہو گا' یہ حالات کے ساتھ بدلتا جائے گا۔۔۔ رسول اللہؐ اور صحابہؓ کے زمانے میں جب وسائل رسل و رسائل محدود تھے اور طریق تھا۔ آج اس کا طریق اور ہو گا۔ مشاورتی نظام کا اصول غیر متبدل رہے گا' البتہ اس نظام کی عملی شکل حسب ضرورت بدلتی جائے گی یا مثلاً قرآن کریم کی اصولی راہنمائی یہ ہے کہ تمام افراد اور ان کی اولاد کی بنیادی ضروریات زندگی کی بہم رسانی نظام معاشرہ کے ذمے ہو گی۔ (**نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ**) (6:151)۔ اب یہ کام نظام معاشرہ کا ہو گا کہ وہ فیصلہ کرے کہ معاشی نظام کی ہیئت کیا ہو جس کی رو سے کوئی فرد معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی اور سامان نشوونما سے محروم نہ رہے۔ اس نظام کی شکلیں حسب ضرورت بدلتی جائیں گی' لیکن یہ اصولی مقصد اپنی جگہ قائم رہے گا۔

حنیف۔ شراب کی حرمت پر بات کرتے ہوئے آپ نے بعض معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے قرآن کے تدریجی طریق کار کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک ضمنی سوال کا موقع نہیں کھونا چاہتا۔ قرآن کریم میں

معاشرتی جرائم کے لئے سزائیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً چوری کے سلسلے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی انتہائی سزا ہے نہ کہ ابتدائی۔ کیا حرمت شراب کی طرح سزاؤں کے سلسلے میں بھی منزل بہ منزل چلنے کا حکم نہیں اور کیا منزل بہ منزل چلنا اس لئے ضروری نہیں کہ جرائم کا معاشرتی نظام کے حالات سے اٹوٹ تعلق ہے۔ یہ تو دھاندلی ہو گی کہ معاشرتی حالات تو بے شک غیر اسلامی ہوں اور سزائیں اسلامی دینی شروع کر دی جائیں۔

پرویز۔ آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآن کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں۔ لیکن اس سے کم تر یا تدریجی سزائیں اس نے خود متعین نہیں کیں۔ اسے اس نے حالات کے مطابق نظام معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت متعدد حالات و کوائف کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ مثلاً معاشرے کی عام اخلاقی سطح، معاشی حالات کے تقاضے، خود ملزم (یا مجرم) کی نفسیاتی کیفیت، اس کی تعلیم و تربیت اور ماحول و عواطف کے اثرات وغیرہ۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سزا کا فیصلہ کیا جائیگا۔ آپ نے غور فرمایا ہو گا کہ قرآن کریم نے لونڈیوں کے لئے زنا کی سزا آزاد عورتوں سے نصف مقرر کی ہے اور اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھا لینے کی بھی اجازت ہے جو عام حالات میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو کوئی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر خوراک کی چوری کی تھی بلکہ سزا یہ کہہ کر ان کے مالکوں کو دی تھی کہ ان کے جرم کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے تو یہ کیوں چوری کرنے مجبور ہوتے! لہٰذا غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی سزائیں ان مل بے جوڑ سی بات ہے۔ اسلام کے اصول و احکام، موکدات و تنبیہات، اوامر و نواہی، فرائض و واجبات، حقوق اور ذمہ داریاں اسلامی نظام معاشرہ کے مختلف پرزے ہیں۔ یہ اسلامی نظام کے اندر اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام نہ ہو تو ان کی کیفیت ایک مشینری کے بکھرے ہوئے پرزوں کی سی رہ جاتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً" (2/208)۔ "تم اس نظام خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"۔ اور اس کے برعکس سختی سے کہا ہے کہ "کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ جتنے حصے پر ایمان رکھو اس کے خوشگوار نتائج تمہیں مل جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں اس دنیا میں ذلت و خواری نصیب ہو گی اور آخرت میں عذاب شدید"۔ (البقرہ آیت 85)

لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم اپنی موجودہ سطح سے ابتدا کریں گے تو اس معاشرے کے انتہائی نقطے تک

بتدریج پہنچیں گے۔ اس نسبت سے ہمیں جرائم اور ان کی سزاؤں کا جائزہ بھی لینا ہو گا۔ سزا تو ایک طرف، حضرت عمرؓ نے ایک ذمی کا یہ کہہ کر ٹیکس واپس کر دیا تھا کہ تم ابھی حال ہی میں اس حکومت کے زیر حفاظت آئے ہو، اس نے تمہارے لئے کیا کیا ہے جو تم اس کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے آگئے ہو!

باقی رہا دین اور سیاست کا اٹوٹ رشتہ، سو اس کے متعلق بھی ہمارے یہ معترضین ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس تعلق کی وضاحت ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ایک اصولی حکم دیا گیا ہے کہ (لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا) (5/8)۔ "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو"۔ یہ ہمارا دین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی حالت میں اور کسی قوم کے سلسلے میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی وقت اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں مجرم قرار پاتا ہے۔ اور اگر (معاذ اللہ) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس اصول کو نہیں مانتا تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ دین جسے سیاست سے الگ کر دیا جائے "تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ اس کے برعکس وہ سیاست ہے جس میں ہر معاملے کا فیصلہ "مصلحت" پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نہ کوئی غیر متبدل اصول ہوتے ہیں نہ اٹل ضوابط۔ "مصلحت" کے مطابق اصول و ضوابط مرتب ہوتے ہیں اور مصلحت ہی کے مطابق ان میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جس سے دنیا اس قدر مادی ترقی کے باوجود جہنم بن رہی ہے۔

حنیف۔ جب ہم عمل کے میدان میں دین اور سیاست کے رشتے کی کڑیاں تلاش کرتے ہیں تو اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو زیر بحث لانا لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اچھائی کا حامل اسلام جمہوریت کی خوبیوں سے بھی متصف ہے۔۔۔۔ اسلام کے دامن میں جمہوریت کی خوبی باہمی مشورے کے حکم کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کے مروجہ نظام کا تعلق ہے، سیاسی جماعتوں کے بغیر اس کا تصور بھی لوگوں کے لئے محال ہے اور ادھر اسلام ہے کہ وہ کسی قسم کے تفرقے یا پارٹی بازی کا متحمل نہیں۔ اس صورت میں آپ کے نزدیک ہمارے دین اور ہماری سیاست کے درمیان کون سا مقام اتصال ہے جہاں جمہوریت سے وابستگی کا شوق بھی پورا ہو سکے اور وہ راہ بھی ہم سے نہ چھوٹے جو خدا نے سورۂ المائدہ میں اسلام کے نام سے ہمارے لئے چنی تھی۔

پرویز۔ حنیف صاحب! جس طرح اسلام ایک اصطلاح ہے اسی طرح موجودہ سیاست میں جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ان مباحث کے متعلق صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے

یہ متعین ہو جائے تو اس کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہو گا کہ "جمہوریت" کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ جب بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پیش نظر سوال پر غور کیا جا سکے۔

حنیف۔ پرویز صاحب! آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی اصطلاح بہت مبہم ہو چکی ہے اور اس کا آپ کے نزدیک یہ حل ہے کہ ہم قرآن حکیم کو اپنے لئے حکم سمجھیں، اس سے ہمیں ایک ایسا نقطہ یا مرکز مل جائے گا جس پر حسن اتفاق سے سب کا ایمان ہے اور جس پر تاریخ نے کوئی تحریفی اثر نہیں ڈالا۔ لیکن باوجود اس خواہش کے کہ میں اس مقام پر آپ کو کسی اختلافی بحث میں نہیں الجھانا چاہتا، مجھے یہ کہنا ہے کہ نبی کریمؐ کی زندگی جسے خود قرآن کریم نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ایک حد تک ہمارے لئے اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر دیا ہے، قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصطلاح پر روشنی نہیں ڈالتی؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی زندگی کے بارے میں بھی اگر ہمیں قرآن ہی سے روشنی مل جاتی ہے تو پھر حکم تو قرآن ہی ٹھہرا۔ لیکن کیا ایک جیتا جاگتا رسول، ایک عبد اور بشر، ایک سربراہ مملکت، ایک سپہ سالار، وحی کا حامل، وحی کا مبلغ اور وحی کا نافذ کرنے والا ایک نبی، اسلام کا ایک بنیادی ستون نہیں؟ اور کیا قرآن حکیم اور نبی کریمؐ مل کر اسلام کے تصور کو معین اور واضح نہیں کر دیتے؟

پرویز۔ قرآن حکیم کی رو سے رسول کا فریضہ محض ایک ایلچی یا ڈاکیہ کا نہیں ہوتا کہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیا اور بس۔ اس کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے ایک معاشرہ متشکل کرے اور یوں دنیا کو دکھا دے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے نبی کریمؐ کی حیات طیبہ کا اہم ترین حصہ اپنے دامن میں ابدی طور پر محفوظ کر دیا تاکہ آنے والے انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضورؐ نے قرآن کریم کے الفاظ میں اپنے بشر ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا جس سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ حضورؐ یہ کچھ ایک نبی کی حیثیت سے نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اگر یہ کچھ ایک نبی ہی کر سکتا تھا تو پھر حضورؐ کی سیرت نوع انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہیں پا سکتی تھی۔

پھر قرآن کریم نے خود نبی اکرمؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ: **شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (3:159)۔ معاملات میں اپنی امت کے افراد کے ساتھ مشورہ کیا کرو اور یہ ظاہر ہے کہ جماعت مومنین کے یہ افراد انسان ہی تھے، فوق البشر نہیں تھے۔ لہٰذا قرآن کریم کے پیش کردہ نقشے کے مطابق اسلام کا جو نظام محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہ،

نے قائم کر کے دکھایا وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے والے افراد کا کارنامہ تھا اور یہی چیز ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے۔ بنا بریں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے' اس کا تو خود قرآن نے حکم دیا ہے۔ قرآن کریم میں اسلام کا تصور مکمل طور پر موجود ہے لیکن حروف کی شکل میں۔ اس تصور کو عملی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ تصور اپنی جگہ مکمل' واضح اور غیر متبدل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر عمل اپنے اپنے زمانے میں ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں جو آج بھی قائم ہو سکتی ہے۔

اب میں آپ کے اصلی سوال کی طرف آتا ہوں۔ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام سے مفہوم ہے زندگی کا وہ عملی نظام جو قرآن کریم میں دیئے ہوئے نقشے کے مطابق متشکل ہو۔ اب لیجئے "جمہوریت" کو میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اس اصطلاح کو اس شدومد سے استعمال کرتے ہیں ان کے پیش نظر جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کی مشینری ہوتی ہے۔ جمہوریت کی مغربی اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ

قانون سازی کا مطلق حق قوم کو حاصل ہے۔

اور اس کی مشینری سے مراد ہے وہ طریق کار جس کے مطابق قوم اپنا یہ حق استعمال کرتی ہے۔ مثلاً طریق انتخاب' پارلیمانی یا صدارتی نظام' حزب موافق و مخالف کا وجود' وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مغربی جمہوریت کے مندرجہ بالا اصول کا تعلق ہے' یہ اسلام کے اصول حکمرانی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ نہ سلطان کو' نہ کسی ڈکٹیٹر کو' نہ قوم کو' نہ اس کے نمائندگان کو' نہ پارلیمان کو' نہ صدر مملکت کو۔ یہ حق ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں اور جن میں رد و بدل کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں۔ جو قانون ان اصولوں سے ٹکرائے گا' وہ قوم کے نمائندگان کی کثرت آراء سے تو ایک طرف' اگر ساری قوم کے اتفاق رائے سے بھی مرتب ہوا ہو گا تو بھی اسلامی نظام میں مردود قرار پائے گا۔

اب رہا جمہوری مشینری کا سوال۔ سو اس کی جزئیات میں سے جو شق قرآنی تعلیم سے متصادم نہیں ہو گی اسے اختیار کیا جا سکے گا۔ جو اس کے خلاف ہو گی اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک (الروم : 31) ہے' اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاست فرعونی کی ایجاد (4/ 28)۔ لہٰذا امت کی مجلس مشاورت میں حزب اقتدار اور حزب مخالف کا وجود قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلے میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کے

مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔ قرآن کریم میں انہی دو گروہوں کا ذکر ہے۔

امت اپنے منتخب افراد پر مشتمل مجلس مشاورت (پارلیمان) مرتب کرے گی تاکہ وہ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ قرآن کریم کے قوانین کو عملاً کس طرح نافذ کیا جائے۔ یہ ان تمام افراد کا مشترکہ مقصد زندگی ہو گا اس لئے اس میں پارٹیوں کا سوال کیا؟ پیش آمدہ معاملے کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کرے گا۔ ان آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس اختلاف کے معنی ہیں معاملے کے مختلف گوشوں کا سامنے آنا تاکہ فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد جو فیصلہ ہو گا اس کی عملی تنفیذ اس پوری جماعت کا متحدہ فریضہ ہو گا۔ اس نظام میں نہ کسی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے نہ ان کے سامنے مختلف اصول ہو سکتے ہیں جن کی بناء پر جماعت مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے۔ اقتدار قرآن کا اور اس کی عملی تشکیل کی ذمہ دار پوری کی پوری جماعت مومنین۔ یہ ہے "اسلامی نظام جمہوریت"۔

حنیف۔ پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن ہمیں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے۔ جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لئے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہو گا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز۔ جب میں نے 1962ء کے دستور میں دیکھا کہ امت میں سیاسی پارٹیوں' یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اس لئے کہ میرے نزدیک قرون اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی متعین کردہ منزل کی طرف اٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اوپر تک اٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی' اسی لئے تھوڑے

ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی- میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیہ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصے کو صحیح مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ جس حصے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج حاصل ہو جائیں گے- بالکل نہیں- اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری نصیب ہو گی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا- میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کی تنظیم کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ "پارٹی ساز جمہوریت" کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں- میں نے اس باب میں' حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں' یعنی وہ نظام جس کے لئے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا------ تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً" نافذ کرنا ہو گا- لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہئے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو- یہ گو مگو کی زندگی------ یہ منکر ے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز---- تو عذاب الیم ہے- قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرز زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے' اگرچہ وہ نتائج بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے- لیکن منافقت کو' جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو' اس نے بدترین طرز زندگی قرار دیا ہے اسی لئے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے (4/145)-

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً" ہی جا سکتے ہیں- اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معین کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں- یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ-

حنیف- نارتھروپ نے اپنی تازہ کتاب "فلسفیانہ انسانیت اور سیاست حاضرہ" میں کلکھون اور سارو کن کی تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین اور عمل کے قالب ان کے فلسفہ حیات سے پھوٹتے ہیں- خواہ وہ شعوری طور پر اس فلسفے سے واقف ہوں یا نہ ہوں- ہر قوم زندگی کے تجربات کو تصورات میں ڈھالتی ہے اور یہی تصورات اس کے سیاسی' معاشرتی اور معاشی اداروں کی شکل میں

ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے قرآن عظیم کی صورت میں کائنات' انسان اور ملت اسلامیہ کے بارے میں واضح تصورات موجود تھے۔ لیکن جب ہم اپنے سیاسی' معاشرتی اور معاشی قالبوں کو دیکھتے ہیں تو یا قرآن کی تعلیم پر شک گزرتا ہے یا یہ خیال آتا ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگ بڑے خلوص کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ اسلام کی مروجہ تعلیم اور اس کے تحت قائم ہونے والا تصور ذات باری' تصور دعاء' تصور انصاف ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اس سے جو حالتیں ابھر سکتی تھیں وہ ابھر چکی ہیں اور اگر ہمیں بہتر نتائج کی توقع ہے تو ہمیں اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے تصورات پر نظر ڈالنی ہو گی کہ وہ کس حد تک صحیح بنیادوں پر استوار ہے؟

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر ہم نے قرآن کی تعلیم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے تو کیا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چلتے ہوئے ہم اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں ہمارے بنیادی تصورات کا سرچشمہ قرآن قرار پائے اور کیا یہ راستہ لازمی طور پر ان پتھروں سے پٹا ہوا ہے جو ہم گالیوں اور کفر کے فتووں کی صورت میں ہر مصلح دین پر اٹھاتے رہے ہیں---- یہاں تک کہ ہم نے یہاں سر سیدؒ اور اقبالؒ کو بھی اس انعام سے نوازا۔

پرویز۔ یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس سے کسی قوم کا تمدن اور کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغام مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ میں صاحب ضرب کلیم کا حریف نہیں ہو سکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو تو اسی طرح رہنے دیتی ہے لیکن ان کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن درحقیقت وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ہماری پوزیشن اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور ان کا مفہوم بھی خود ہی معین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام اتنا ہے کہ

ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے معین کر لیں اور ان کے غیر قرآنی مفہوم کو جھٹک کر الگ کر دیں' اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر سے وہ توانائی عطا کر دیں گے جو نہ صرف ہمیں خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دے گی۔

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ مفاد پرست گروہ چاہتے ہی نہیں کہ ایسا ہو اس لئے وہ مذہب پرستی کے لبادے میں ہر ایسی کوشش سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے کفر کے فتووں سے نوازتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی تصورات کو ایک چلا ہوا کارتوس قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اسلامی تصورات نہیں بلکہ مفاد پرست گروہوں کے تراشیدہ تصورات ہوتے ہیں، جن پر اسلامی ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ اگر ان کے سامنے دین کے اصلی تصورات اور ان کا صحیح مفہوم آجائے تو وہ دیکھیں گے کہ یہ تصورات کس قسم کا حیات بخش نظام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے سب سے بنیادی تصور **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** کو لیجئے۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اسے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ یہ تصور جس قدر عظیم انقلاب کی بنیاد ہو سکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب "الٰہ" کے معنی پرستیدہ اور عبادت کے معنی پرستش کر لئے جائیں تو اس سے جذبات کی حد تک تو ہم تسکین پا سکتے ہیں۔ اس تصور کا عملی طور پر زندگی سے کوئی واضح تعلق نہیں رہتا۔ قرآن کا کام درحقیقت مذہب کے تراشیدہ تصورات کو خدا کے عطا کردہ تصورات سے بدلنے کا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم ان پتھروں سے بھی بچ جائیں جن سے ہر مصلح کا راستہ پٹا پڑا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ تصورات کو قرآنی تصورات سے بھی بدل دیں۔

میرے عزیز بھائی! میرے نزدیک' یا یوں کہئے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا کے ہر فرعون' ہر ہامان اور ہر قارون سے جنگ مول لینا ہے اور یہ جنگ ایسی ہے جس میں مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ہم لا الٰہ نہیں کہتے الا اللہ پر آہی نہیں سکتے۔ یہی انبیاءؑ کا راستہ تھا اور یہی راستہ ہر اس شخص کو اختیار کرنا ہو گا جو اس قسم کا ارادہ رکھتا ہے۔ لا الٰہ میں ہر غیر خداوندی بت کو پاش پاش کرنا ہو گا اور ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پجاری اپنے معبودوں کو نیست و نابود ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

حنیف۔ قرآن حکیم نے ایک جگہ کہا ہے:

"کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ کچھ پیش نہ آئے

گا جو تم سے پہلوں کو پیش آیا۔ انہیں مصائب و آلام نے گھیر لیا اور وہ طوفان حوادث میں یوں تھپیڑے کھاتے رہے کہ نبی اور اس کے رفقاء پکار اٹھے کہ اے اللہ ! تیری نصرت کب آئے گی"۔ (البقرہ : 214)۔

خداوند کریم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کے ذکر کا جو التزام برتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے آزمائش و ابتلا کو مومن کی زندگی کا لازمہ گردانا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ درد پیدا ہوا کہ ہم نے اسلام کی آسان تعلیم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے انہوں نے میرے خیال میں یہ احتیاط نہیں برتی کہ کہیں اس شوق تسہیل (Over Simplification) کے فطری نتیجے کے باعث اپنے مقتدیوں کو اس راہ پر ڈال دیں کہ وہ راہ حق ہی کو آسان سمجھ بیٹھیں۔ تعلیم کے بارے میں تو قرآن نے خود بہت تاکید سے اپنے یسریا آسان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے عمل کی کٹھنائیاں تو کم نہیں ہو جاتیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ مشکل بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سلسلے میں———— (Over Simplification) بھی اسلام کے ساتھ زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسے گھرانوں کو اسلامی شعائر کی بڑے اعتماد سے توہین کرتے دیکھا جس میں قرآن کے یسر ہونے کا غلط تصور پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں صوم و صلوۃ جیسے احکامات میں وقت کا اور خیرات میں مال کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ ادھر عملی سطح پر وہ دو تقریریں اور چار پمفلٹ پڑھ کر اسے تدبر اور تعقل کی معراج سمجھتے ہوئے دوسرے تمام مسلمانوں کو بے علم بلکہ گمراہ گرداننے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالت کچھ ایسی ہے جیسی ایک نسل پیشتر ان لوگوں کی تھی جو کیمونزم سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ لوگ بحث تو مارکس کا نام لے لے کر کرتے تھے حالانکہ داس کیپٹیال کے درشن بھی انہیں نصیب نہ ہوئے تھے مگر نقد علم کیمونزم پر چند مفت بٹنے والے کتابچوں پر مبنی تھا۔

پرویز۔ غلط روش پر چلنے والی قومیں ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھلاتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں پہلے قرآن کریم کو ایسا مشکل بتایا گیا کہ اس کا سمجھنا "گیت ودیا" سے کم مشکل نہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت حصول ثواب کے لئے کافی سمجھ لی گئی۔ اور حصول جنت کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اس کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ "جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے (ابوداؤد)۔ اور طاعون یا اسہال سے یا ڈوب کر مرنے سے شہادت کا درجہ عطا ہو جاتا ہے (نسائی)۔ اب جھولا نیچے آیا تو قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے اتنے سے غور و فکر کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی جتنی مثلاً شیکسپیئر کے سمجھنے کے لئے۔ باقی رہا عمل سو اس کے لئے یہ برہمو سماجی عقیدہ اپنا لیا گیا کہ اصل بات "نیک عملی" ہے۔ جس عمل کو کوئی نیک سمجھے اسے کر لیا کرے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

دین ایک عالم گیر انقلاب کا داعی ہے جس کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینی ناگزیر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی ہی مجاہدانہ حرارت کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کے صحیح انقلاب آفرین تصورات واضح اور معین شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اسے بتا دیا جائے کہ اس راہ میں کتنے خطرناک مقامات آتے ہیں لیکن اس کی منزل کس قدر حسین اور تابندہ ہے۔ اس کے بعد افراد معاشرہ سے کہہ دیا جائے کہ یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنے لئے فیصلہ کیجئے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے گی یا نہیں۔ یونہی سراب آسا تخیلات کے ماتحت زندگی بسر کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دیجئے نہ دین کو۔ نہ خود ذلیل ہوجئے نہ اسلام کو بدنام کیجئے۔

حنیف۔ پرویز صاحب! میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ نے برسہا برس تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اور اپنے درس کے سلسلے کی وساطت سے لوگوں کے سامنے اپنے خیال کے مطابق دینی تصورات کی صحیح شکل رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ کی اس کوشش نے' کہ دین کے ان بنیادی تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ بعض لوگوں میں یہ جھوٹا اعتماد پیدا کر دیا ہے گویا وہ اسلام کی کنہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کیا آپ کے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے چند پمفلٹ پڑھ کر یا چند تقریریں سن کر اور ان سے متاثر ہو کر بعض لوگ اپنے ہمسایوں سے اس انداز میں بحث مباحثہ کرنے چل دیتے ہیں کہ انہوں نے تو دین کی روح کو پا لیا ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔

پرویز۔ حنیف صاحب! میں نے شروع ہی سے اس قسم کے خدشات کو بھانپ لیا تھا اور اسی لئے میں نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی۔ میں اپنی قرآنی فکر کو فضا میں بکھیرتا چلا جاتا ہوں اور اس سے مختلف مقامات پر مختلف نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف قارئین اور سامعین کے اختلاف مقاصد کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں کا مقصد اپنے پندار کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے میری تعلیم سے ایسی باتیں لے لیں جن سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے ہم عصروں پر اپنے علم و فضیلت کی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا' یہ انہوں نے پا لیا۔ لیکن اس گروہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے اندر میری فکر نے طالب علمانہ جذبے کو ابھارا ہے۔ وہ حقائق کو از خود سمجھنے کے لئے انتہائی محنت کرتے ہیں لیکن ان کے طالب علمانہ عجز کا یہ عالم ہے کہ ان پر نیوٹن کے اس مقولے کا اطلاق ہوتا ہے:

"ہم علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے چن رہے ہیں"۔

لیکن میری کوششوں کا حاصل اس سے بڑھ کر ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اب فضا میں قرآن کی آواز

عام ہو رہی ہے حتیٰ کہ اپنے تو ایک طرف' مجھے گالیاں دینے والے بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنے سامعین کے سامنے کچھ خدا لگتی باتیں کیا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی ایک اچھے انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

حنیف۔ پرویز صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں بہت گہرے اور ہمہ گیر معانی پائے جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر بعض تصورات کی حد تک روایتی توجیہات بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں صلوٰۃ کا ہرگز اتنا مفہوم نہیں ہے کہ چند رکعت نماز ادا کر لی جائے لیکن جب صلوٰۃ کے وسیع تر معانی پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دو رکعت والی نماز سے انسان بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا آپ کی فکر نے بھی بعض اس طرح کے نتائج پیدا نہیں کئے؟

پرویز۔ حنیف صاحب! دین میرے نزدیک زندگی کے ایک عملی نظام کا نام ہے اور جہاں تک ان ارکان اسلام کا تعلق ہے جن کی سند قرآن کریم سے ملتی ہے وہ اس نظام کے ستون ہیں' یا یوں کہئے کہ اس کے پروگرام کے لاینفک اجزا ہیں۔ اگر وہ دین کے نظام کے تحت ادا ہوں تو ان کے حسین نتائج سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہے تو پھر ارکان کی شکل و صورت تو باقی رہ جاتی ہے' ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ میرا پیغام یہ ہے کہ ان ارکان کو پھر سے دین کا جز بنایا جائے تاکہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں موجودہ حالات میں بھی' جب کہ وہ نظام موجود نہیں' ان ارکان کو اسی شکل میں قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اس کی تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم میں جب بھی احساس زیاں بیدار ہوا' انہی ارکان کے "حشر اجساد" سے ہمیں حیات نو عطا ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کرتا تو اس پر میرا کوئی جبر نہیں۔ حقیقت یہ ہے حنیف صاحب! میں نے اپنی پوزیشن صرف ایک مبلغ کی رکھی ہے' داعی یا کسی جماعت کے امام کی نہیں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس سے بھی متفق نہیں ہو سکتا کہ چونکہ دین کے صحیح تصورات پیش کرنے سے لوگوں کی نظروں میں ان بے روح رسومات کی اہمیت کم ہونے کا خدشہ ہے اس لئے دین کی صحیح شکل سامنے لانی ہی نہیں چاہئے۔ میرے "حلقہ سخن" میں ایسے ارباب فکر و عمل بھی موجود ہیں جو ان ارکان کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ جب یہ ارکان اسلام کے نظام کے اجزاء بنے تو ان سے کس قدر خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔

حنیف۔ قرآن حکیم نے ایمان کو عمل پر اولیت دی ہے۔ عمل کی اہمیت کو اس نے بے شک بے حد

اجاگر کیا ہے' لیکن عمل صالح کا سرچشمہ ایمان ہی کو قرار دیا ہے اور ایمان انسان کا اجتماعی مسئلہ نہیں ذاتی مسئلہ ہے۔ ہمارا عمل بے شک اجتماعی قالبوں میں ڈھل سکتا ہے لیکن ایمان ہم اپنے اندر اتر کر ہی لا سکتے ہیں۔' یہ نہ تو خوف سے پیدا ہوتا ہے' نہ جبر سے' نہ معاشرے کی ملامت سے' نہ تقلید سے۔ اس نظر سے دیکھیں تو فرد کی اہمیت اداروں سے اولین ہے۔ لیکن آج کل ایک انداز فکر یہ ابھر رہا ہے کہ اداروں کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے اور معاشرے کی اہمیت کو اتنا بڑھایا چڑھایا جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے شریک ٹھیرنے میں شاید ہی کوئی کسر رہ جاتی ہو۔

اس انداز فکر کا ایک مظہر یہ ہے کہ سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرتی قوانین میں جکڑنے کے لئے دھڑا دھڑ قانون سازی کی جائے' چنانچہ ملک میں سیاست کا بازار اس بہانے گرم کیا جاتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے لئے چناؤ ہو گا۔ پھر ملک بھر کے بے خبر' بے درد' اور غیر ذمہ دار لوگوں کو قانون سازی کے اعزاز میں دھڑے بندیوں' مفاد پرستیوں اور دھاندلیوں کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ بحثیں ہوتی ہیں کہ اسلامی قانون بن سکتا ہے یا نہیں۔ مناظرے ہوتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ قانون سازی کا یہ تماشا ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کہ افراد کو اندر سے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ قانون کا احترام تو خدا کے خوف سے' اس کے قول فیصل پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ ایمان ہی موجود نہیں تو قوانین کی زنجیریں ریت کے رسوں سے بھی کمزور ثابت ہوں گی۔

> Polanyi کا برسوں کا کام Personal Knowledge اس امر پر دال ہے کہ فرد ہی تمام معاشرتی ترقی کا سرچشمہ ہے اور علم کا حصول افراد ہی کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔
>
> اسی طرح قرآن میں قوانین صرف افراد سے متعلق ہیں لیکن اجتماعی مسائل کے لئے اصول دیئے گئے ہیں۔ فرد کے حقوق تو اتنے اہم سمجھے گئے کہ انہیں خدا نے خود متعین کر دیا لیکن معاشرتی معاملات کو اصول بتا کر ان کی تشکیل کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

میں یہ باتیں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کیونکہ آپ کے بارے میں عام احساس یہ ہے کہ آپ معاشرے کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔

میں اس مقام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اور کیا فرد کو بدلے بغیر معاشرے کو بدلنا ممکن ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا افراد کو نظر انداز کر کے اداروں کی تشکیل کا جتن گاڑی کو گھوڑے سے پہلے جوتنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا؟

عَبَسَ وَتَوَلّٰی ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ○ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی ○ (80:1-3) کی آیات معمولی سے معمولی فرد کو بھی پوری اہمیت دینے کا واضح حکم نہیں؟

پرویز۔ جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ افراد نہ ہوں تو معاشرہ کہاں سے بنے گا؟ اس لئے بنیادی اہمیت افراد ہی کو حاصل ہے۔ صحیح ایمان سے افراد کے اندر جو تبدیلی واقع ہو گی اس کا مظاہرہ معاشرے میں ہو گا۔ افراد کی تعلیم و تربیت اس لئے نہایت ضروری ہے۔

لیکن ہمارے ہاں دین کا تصور ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور ہم نے اسے "مذہب" کے مرادف المعنی سمجھ کر اسے انفرادی مسئلہ بنا لیا ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق۔ میری بصیرت کے مطابق یہ تصور قرآنی نہیں۔ دین اجتماعی نوعیت کا نظام ہے اس لئے وہ امت کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں تاکہ دین کا صحیح تصور ان کے سامنے آسکے۔ میری پیش کردہ فکر میں جو معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے تو اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اگر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر ہو تو اس سے محیر العقول انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں اور یہ بات کسی دوسرے اجتماعی نظام سے ممکن نہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسلام اپنے لئے ایک الگ مملکت چاہتا ہے' اپنی آزاد حکومت چاہتا ہے۔ میں دین کے اسی تصور کو اجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں۔ ورنہ اگر دین خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق ہی کا نام ہو تو اس کے لئے نہ الگ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اپنی آزاد حکومت کی۔

جب دین کے تصورات اور ان کے انسانیت ساز جنت بداماں درخشندہ نتائج کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لیا جائے تو اس سے اس ایمان کی ندیاں رواں ہو جاتی ہیں جن کا سرچشمہ قلب انسانی کی گہرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔ لیکن صحیح تعلیم و تربیت تو آنے والی نسل کی ہو سکتی ہے (اس کے لئے میں اٹھارہ برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں)۔ جن افراد پر ہمارا موجودہ معاشرہ مشتمل ہے وہ موجودہ نہج پر پختہ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس معاشرے میں اسلامی اقدار کو کیسے رائج کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام قانون کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ اس کے لئے معاشرے میں قرآنی قوانین کا نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔

جو لوگ تعلیم و تربیت سے قطع نظر کر کے محض حکومت کے ڈنڈے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں وہ میرے نزدیک یہودی شریعت کے تصور کو تو کچھ سمجھتے ہیں لیکن نبی اکرمؐ کے معلم ہونے کی حیثیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔

اس مقام پر شاید کہہ دیا جائے کہ نبی اکرمؐ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے جماعت کی تشکیل کی تھی قانون کا اعلان ان پر بعد میں کیا گیا تھا۔ لیکن تم موجودہ مسلمانوں پر قانون کا اطلاق ضروری سمجھتے ہو' اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا تھا اور انہیں مسلمان کرنے کا طریقہ تعلیم و تربیت تھا۔ اس لئے اس وقت جو معاشرہ متشکل ہوا تھا وہ تھا ہی ان مسلمانوں پر مشتمل جو تربیت یافتہ تھے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت اس کے برعکس ہے۔ یہاں پہلے سے ایک معاشرہ موجود ہے جو مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ مسلمان وہ ہیں جو تعلیم و تربیت کے بعد مسلمان نہیں ہوئے' وہ بس مسلمان ہیں۔ ان کی آئندہ نسل کو تو اسی طرح "مسلمان کرنا" چاہئے جس طرح نبی اکرمؐ نے دوسروں کو مسلمان کیا تھا۔ یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن موجودہ مسلمانوں کو علیٰ حالہ نہیں چھوڑا جا سکتا' انہیں لامحالہ کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔ تو وہ قانون اور ضابطہ اسلامی کیوں نہ ہو؟ اس سے بھی بڑی حد تک معاشرتی اصلاح ہو جائے گی۔

میں اسے پھر واضح کر دوں کہ افراد اور معاشرے کا تعلق ایک مشین کے پرزوں اور خود مشین کا تعلق ہے' جب تک پرزے صحیح حالت میں نہ ہوں گے مشین صحیح کام نہیں کرے گی۔ لیکن پرزے بھی تو اسی وقت اپنا مقصد پورا کریں گے جب وہ مشین کے اندر فٹ ہوں گے۔ ایک پرزہ اپنی ذات میں کتنا ہی اصلح اور گراں بہا کیوں نہ ہو اگر وہ مشین سے باہر رکھا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا عدم و وجود برابر ہے' اور مشین کے اندر ایک معمولی سا پیچ بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

دین کا نظام وہ مشینری ہے جس کے اندر ہر پرزہ (افراد معاشرہ) اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا فریضہ ادا کرتا اور یوں اپنی ہستی کا مقصد بروئے کار لاتا ہے۔ اس مثال میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مشین کے پرزے بے جان ٹکڑے ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر مصروف نقل و حرکت رہتے ہیں۔ اس کے برعکس افراد معاشرہ ذی حیات اور قابل نشوونما نفوس ہوتے ہیں۔ اس نظام کے اندر ان کی نقل و حرکت بالارادہ ہوتی ہے جس سے خود ان کی صلاحیتوں میں بھی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی جہاں اسلامی نظام کا مجموعی نتیجہ عالمگیر انسانیت کے لئے سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا ضامن ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس سے خود افراد معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی جلا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس نظام اجتماعی کے اندر ان افراد کی انفرادیت گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں یہ نظام خود ان افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بن جاتا ہے۔ یہ چیز دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں۔ دنیا میں جہاں فرد ہوتا ہے

وہاں نظام کا تصور نہیں ہوتا۔ (مذاہب عالم میں یہی کیفیت ہوتی ہے) اور جہاں نظام ہوتا ہے وہاں فرد باقی نہیں رہتا (جیسے مغرب کے جماعتی نظاموں میں ہو رہا ہے)۔ یہ خصوصیت اسلامی نظام ہی کی ہے کہ اس میں نظام خود افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے۔ فرد اور معاشرے کا یہی وہ تعلق ہے جسے اقبال نے اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آراء و نگہدار خود است
ایکہ در قافلہ باہمہ رو بے ہمہ شو

حنیف۔ خداوند کریم نے قرآن میں انسان کی دعوت دی ہے کہ وہ اس کی آیات کو آفاق و انفس میں تلاش کرے۔ جہاں تک آفاق کا تعلق ہے علوم و فنون کی راہ سے، سمع و بصارت اور ذہن کی راہ سے انسان اس قائم بالحق کائنات میں اللہ کے واضح اور نت کھلتے چلے جانے والے نشانات دیکھتا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ جہاں تک انفس کا تعلق ہے علمی سطح پر نفسیات نے عموماً اور تحلیل نفسی نے خصوصاً کچھ راہیں تراشی ہیں۔ پھر فلسفیوں نے انسانی ذات پر جو کام کیا ہے اس نے کچھ دریچے کھولے ہیں۔ سری آرو بندو نے "حیات ربانی" میں اور او سپنسکی نے "اعجاز کی تلاش" میں انسان کے اندر بسنے والے جہانوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارے یہاں اقبالؒ نے مکان دروں کے نظریئے سے اس اقلیم کی جانب توجہ دلائی ہے جو عموماً سربستہ رہتی ہے۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تصوف کی صحیح تعلیم یہی نہیں تھی کہ خدا کی آیات کو انفس میں تلاش کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے اور کیا جب تک آفاق کے ساتھ ساتھ انفس میں خدا کی آیات کا وجود نہ نظر آئے یہ ممکن ہے کہ انسانی عمل کو وہ سرچشمہ نصیب ہو جائے جو دل میں خدا پر ایمان لانے ہی سے پھوٹتا ہے؟

آج ہم اضطراب، نامرادی اور سنگدلی کے جو مظاہر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کیا ان کی بناء پر یہ نہیں کہ ہم نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کو اس کا جائز حق نہیں دیا، خصوصاً جبکہ خدا کا حکم موجود ہے کہ گناہ کے ظاہر سے بھی بچو اور اس کے باطن سے بھی بچو؟ بے شک اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا اور تصوف کی مروجہ شکلیں رہبانیت بلکہ ویدانت کی گھسی پٹی صورتوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کیا تصوف کا جوہر ـــــــ یعنی انفس میں خدا کی آیات کی تلاش ـــــــ ہمارے لئے ان راہوں کو روشن نہیں کر سکتا جو انسان کو لپک کر خدا کا رفیق بن جانے کی رغبت دلاتی ہیں؟

پرویز۔ تصوف ایک اصطلاح ہے اور جب تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے اس کی تائید و تردید میں

بات کرنا مفید نہیں ہو گا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ تصوف یا صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں، حتیٰ کہ اس زمانے کے دوسرے لٹریچر میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھئے کہ تصوف ہے کیا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی علم کے ذرائع تجربہ، مشاہدہ اور تفکر ہیں۔ ان سے بلند ایک اور ذریعہ علم ہے اور وہ ہے وحی ——— جو انبیاء کو ملتی ہے ——— وحی میں نبی کے ذاتی فکر یا تجربے یا مشاہدے، کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نبی حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا، حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس میں معروضیت (Objectivity) بنیادی چیز ہے۔ وحی کا سلسلہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا علم کا یہ ذریعہ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب ہمارے لئے علم کے دو ہی چشمے ہیں۔ ایک قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق اور دوسرا ان کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر۔ اگر کوئی شخص آج حقیقت کا علم خدا سے براہ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دراصل نبوت کا مدعی ہے۔

تصوف کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ صوفی حقیقت کا براہ راست علم خدا سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرخیل صوفیاء شیخ محی الدین ابن عربی کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا علم اس مقام سے حاصل کرتے ہیں جہاں سے نبی کو علم ملتا تھا۔ یہ تصوف کی وہ بنیاد ہے جو ختم نبوت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کا پتا نشان قرن اولیٰ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ تصور جو ایک بہت بڑی سازش کا پیش خیمہ تھا مسلمانوں میں بہت بعد میں لایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے"۔

اب آیئے انفس و آفاق والی آیت کی طرف۔ اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ قرآن جس انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے، اسلام کی اولیں مخاطب قوم اس کو خود اپنے اندر بھی دیکھے گی اور دیگر اقوام عالم کے اندر بھی۔ لیکن انسان کی مضمر قوتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان پر غور و فکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے کئی مقامات پر تاکید کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ داخلی مضمر قوتیں کیا ہیں۔ اس کے متعلق کسی پیچیدگی میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی اور جماعتی طور پر ہم ہر روز ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کے لئے علم کی قوت، بے پناہ ہمتوں اور قربانیوں کے لئے یقین محکم (ایمان) کی قوت، نظم و ضبط کے تابع کام کرنے والے افراد کی مجموعی قوت، زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے صحیح عمل کی قوت، وغیرہ وغیرہ۔ یہ قوتیں قوانین خداوندی پر عمل کرنے سے ابھرتی ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اور جن کا محسوس مظاہرہ سب سے پہلے محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہ، کے اسوۂ حسنہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا نام کردار کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ لیکن انسان کی بعض داخلی قوتوں کا ایک فنی پہلو بھی ہے۔ جس طرح ایک پہلوان خاص قسم کی کسرت اور ریاضت سے اپنی جسمانی قوت اتنی بڑھا لیتا ہے کہ وہ عام انسان ہی دکھائی نہیں دیتا

اسی طرح خاص مشقوں کے ذریعے سے انسانی قوت ارادی کو اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ اس سے بعض ایسی باتیں سر زد ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ ہندوؤں کی سادھیوں' مغ بچوں کے آتشکدوں اور عیسائیوں کی خانقاہوں (وغیرہ) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کی ایک منجھی ہوئی شکل آج ہمیں ہپناٹزم کی صورت میں ملتی ہے۔ انسان کی یہ قوت خالص فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس قسم کی ریاضتیں اور مشقیں کرے۔ مگر توہم پرستی کی تاریکیوں میں اس کو "روحانیت کی کرامات" قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی کو تصوف کا کمال قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ ایک فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ دین' قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے جس سے ایک فرد کے اندر حسین و جمیل کردار کی روشنی چمکتی ہے اور ان افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ مرتب ہے وہ کاروان انسانیت کو اس منزل مقصود کی طرف لیجاتا ہے جو شرف و تکریم انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔

قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کو سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز بتایا ہے (اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (68:4)۔ اس پر شاہد ہے) صحابہ کبارؓ کے بھی حسن سیرت و بلندی کردار ہی کا تذکرہ کیا ہے' ان کی کسی روحانی قوت کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جہاں قوموں کے عروج و زوال کے سلسلے میں یہ ابدی قانون بیان کیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ اپنے انفس میں تبدیلی نہیں کرتی۔ تو اس سے قوموں کی نفسیاتی تبدیلی مراد ہے۔ تصوف کی رو سے کوئی روحانی تبدیلی مقصود نہیں۔ تصوف تو قوم یا اجتماعی زندگی سے بحث ہی نہیں کرتا۔ قرآن کے لغت میں تصوف کے لئے رہبانیت کا لفظ آیا ہے جسے وہ ذہن انسانی کا خود تراشیدہ مسلک قرار دیتا ہے۔ تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصور پیش کرے۔

حنیف۔ ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیاء کرام کی مرہون منت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئت اجتماعی پر بہت گہرا ہے' بلکہ اہل تصوف نے آگے بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالیؒ' شیخ احمدؒ سرہندی' شاہ ولی اللہؒ اور بعض کے نزدیک اقبالؒ کا بلند پایہ

مجتہدین ہوتے ہوئے بھی تصوف سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا مقام اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت اور تصوف باہم شیر و شکر ہو جائیں۔

پرویز۔ حنیف صاحب! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے درحقیقت کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئت اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لئے اس قدر کاہش و کاوش کرنی پڑ رہی ہے لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔

باقی رہی شخصیتیں۔ تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ : **تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2/134)۔

"یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں گزر گئے' جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے۔ اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہو گا۔ اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا"۔ لہٰذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ متقدمین ہوں یا متاخرین' ان میں سے کسی کے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے انہیں ہم قابل ستائش سمجھیں گے۔ جو اس کے خلاف جائیں گے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لئے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل۔

ضرورت رشتہ

40 سالہ اکلوتے کنوارے' تعلیم یافتہ ماہر طب بیٹے کیلئے تعلیم یافتہ ترجیحاً" دینی معلمہ کا بغیر جہیز نکاح کرنا مطلوب ہے۔
سیدہ حمیدہ (والدہ)_ پوسٹ بکس 7083 - فون : 205090 لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ

ضمیر

ضمیر زندہ ہو یا مردہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یقیناً آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ نئی بات کیسے سامنے آگئی۔ حالانکہ ہم تو زندہ ہی ضمیر کے لئے ہیں اور مرنا بھی ضمیر ہی کے لئے چاہتے ہیں۔ ایسا کون ہو گا جو بے ضمیر کہلانا پسند کریگا یا جس کا کوئی ضمیر ہی نہ ہو۔ مگر ہم میں کتنے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ضمیر ہے کیا چیز؟ اسے سمجھنے کے لئے ہم اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں۔ ضمیر کا زیادہ تر استعمال انتخابات کے دنوں میں ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ کا استعمال کرتا ہے۔ ملک میں جتنی سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں، ان کے ووٹروں کے اتنے ہی ضمیر ہوتے ہیں۔ آزاد امیدواروں یا رشتہ داروں کو ووٹ دینے والوں کا ضمیر دوسروں سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ الیکشن کے دنوں میں ووٹروں کا ضمیر خوب جاگ رہا ہوتا ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی ووٹروں کا ضمیر سو جاتا ہے۔ الیکشن جیتنے والوں کا ضمیر البتہ جاگ جاتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے مطابق ہر روز نئے نئے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ووٹر ہوں یا نمائندے ضمیر ہر شخص کا الگ الگ ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے 1953ء میں لاہور میں ہونے والے مذہبی فسادات کے نتیجے میں قائم ہونے والے منیر کمیشن کے سامنے ملک کے مایہ ناز علماء کی بیان کردہ مسلمان کی تعریف الگ الگ تھی۔ کاش ان لوگوں کے سامنے قرآن ہوتا۔

ضمیر عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو اردو میں اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہونے کے بجائے اصطلاحی معنوں میں رائج ہو چکا ہے اور اب ایک مستقل اصطلاح یا قدر Value بن چکا ہے۔ کوئی بھی لغت، گرامر یا ڈکشنری اٹھا کر دیکھئے۔ آپ یہ کچھ دیکھیں گے۔

ضمیر۔ (ع) مونث۔ دل۔ بھید۔ خیال۔ اسم کی ایک قسم۔ ضمائر جمع۔ (فیروز اللغات)

ضمیر۔ نحویوں کے نزدیک وہ کلمہ ہے جو متکلم مخاطب اور غائب پر دلالت کرے۔ جیسے انا۔ انت۔ ھو۔ اس کی جمع ضمائر ہے۔

انگریزی میں اسے Conscience کہتے ہیں۔ Conscience کا ترجمہ ہے۔ اچھے برے کی اخلاقی تمیز۔ ضمیر،

ایمان- Conscience Money_ (ایمان بہاء)- یعنی وہ رقم جو ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو یا نہ ادا کی گئی ہو' اسے اپنے ضمیر کی تشفی کے لئے گمنام طور پر ادا کرنا-

Conciencious- ایمان دار- بااصول- (یہ انگریزی سے اردو ڈکشنری میں موجود ترجمے ہیں)

بات اصول کی ہو تو ہر شخص کے اصول اس کے اپنے تیار کردہ ہوتے ہیں- جو جتنا بااصول ہو گا- اتنا ہی باضمیر کہلائے گا حالانکہ ضمیر خدا کی طرف سے عطا کردہ ایسی صفت نہیں ہے جو تمام انسانوں میں یکساں پائی جائے- نہ ہی یہ کوئی جبلی قوت ہے- ہر شخص کا ضمیر اس کے ماحول کے مطابق بدلتا رہتا ہے- عربی میں ضمیر مونث ہے اور اردو میں مذکر- ضمیر اگر زمان و مکاں سے ماورا ہوتا تو کم از کم اس کی جنس تو ہر جگہ ایک ہوتی-

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ہر شخص کا ضمیر اس کے ماحول کے مطابق بنتا اور بگڑتا رہتا ہے- ہم اس کو سمجھنے کے لئے چند مثالوں یا ماحولیات (گندگی یا آلودگی والا ماحولیات ہرگز نہیں بلکہ ماحول کی جمع) کو سامنے رکھیں گے- آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس خصوصیت کا اظہار انتخابات کے دنوں میں زیادہ ہوتا ہے- جو شخص جس سیاسی جماعت سے وابستہ ہوتا ہے اس کا ضمیر اسی جماعت کی تائید کرتا ہے' اور وہ اپنے ضمیر کے مطابق اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دیتا ہے- کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بظاہر اسی سیاسی جماعت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے' بیج سینے پر سجاتا ہے' جھنڈا ہاتھ میں لئے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر گھومتا ہے' لیکن اپنی ذاتی پرخاش کی وجہ سے اپنی ہی پارٹی کے امیدوار کو ووٹ نہیں دیتا- یہ اس لئے کہ خفگی کی وجہ سے اس کا ضمیر اسے اسکی اجازت نہیں دیتا- لیکن اگر وہ جیت جائے تو سب سے پہلے اس کے گلے میں ہار ڈالتا ہے- اس وقت اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرتا- آپ نے غور کیا کہ ایک وقت میں اس کا ضمیر اسے کچھ اور کہتا ہے اور دوسرے موقع پر کچھ اور- سوال یہ ہے کہ کیا یہ علامتیں کسی ایسے شخص کی ہو سکتی ہیں- اس کا جواب یہی ہو گا کہ ہرگز نہیں- یہی حالت تمام سیاسی جماعتوں کی ہوتی ہے- ہر ووٹر کا ضمیر اپنی جماعت کے امیدوار کو ووٹ دینے پر مطمئن ہوتا ہے اور جب اس کی جماعت کا امیدوار ہار جاتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ لوگ بڑے بے ضمیرے ہیں- ان لوگوں کا کوئی ضمیر ہی نہیں ہے- کھاتے پیتے ہمارے کیمپ میں تھے اور ووٹ مخالف کو دیئے- اب ذرا جیتے ہوئے امیدوار کے پاس آیئے- ہر ایک کی زبان پر یہی ہو گا- کہ لوگوں میں ضمیر ہے- یہ زندہ ضمیر کی علامت ہے کہ انتخابات آزادانہ ہوئے اور ہر ایک نے اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ کا استعمال کیا- آپ نے غور کیا- جو شخص جس جماعت کے ساتھ وابستہ ہے اس کا ضمیر اسی طرح کا بن گیا ہے- یہی وجہ ہے کہ آزاد امیدوار بہت کم کامیاب ہوتے ہیں- جو آزاد کامیاب ہو جاتا ہے وہ خوشی سے

پھولا نہیں سماتا کہ لوگوں نے سیاسی وابستگیوں کو ٹھکرا کر اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ کا استعمال کیا۔ اب خدا ہی
بہتر جانتا ہے کہ کس نے کونسا ضمیر استعمال کیا۔ اگر یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ خصوصیت ہوتی تو یہ ہر
جگہ یکساں ہوتی۔

کچھ خبر اُن باضمیر مذہبی جنونیوں کی بھی لیجئے جن کا ضمیر مذہب کے نام پر خون بہانے پر مطمئن ہو جاتا
ہے۔ ایک عرصہ سے ملک میں فرقہ واریت کا عذاب اپنے پورے عروج پر ہے۔ ایک مذہبی جماعت دوسری
مذہبی جماعت کے مولویوں' عالموں اور کارکنوں کو قتل کر دینے کے در پہ رہتی ہے۔ ایک دوسرے کی مذہبی
عبادتگاہوں اور مسجدوں پر بم پھینک کر ضمیر کو مطمئن کیا جاتا ہے اور گنتی رکھی جاتی ہے کہ کتنے قتل ہو گئے۔
یقیناً بعد میں اپنے ضمیر کو مزید مطمئن کرنے کے لئے بغلیں بھی بجائی جاتی ہوں گی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے
کہ ان کے ضمیر کو اس طرح کا بنا دیا گیا ہے۔ ان کا "برین واش" Brain Wash کر کے انہیں جنت کا
سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا ہے۔ سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں فریق اپنے مقتولین کو شہید اور
دوسروں کو واصلین جہنم کا درجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون ہلاک ہوا اور کون شہید۔
قرآن کریم میں شہید ان معنوں میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ قرآن میں قتل ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔
اسی طرح نماز کا عادی مسلمان نماز نہ پڑھنے پر یہی کہتا ہے نماز نہ پڑھوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے
حالانکہ یہ عادت کی بات ہے۔ ضمیر کی نہیں۔

میں 1985ء میں مذاہب کے مطالعہ کے سلسلہ میں ہندوستان گیا تھا۔ وہاں بھی میں نے اکثر ہندوؤں کو یہ
کہتے سنا کہ مندر نہ جانے پر ہمیں ہمارا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اسی طرح ہر مذہب کے حامل شخص کو مذہبی
رسومات ادا نہ کرنے پر ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ماحول سے
اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ اس ماحول سے خود کو علیحدہ دیکھ کر اپنے آپ کو بے ضمیرا محسوس کرنے لگتا ہے اور
اسی ماحول کے ساتھ چل کر خود کو باضمیر محسوس کرتا ہے۔

مضمون لکھ رہا تھا کہ بی بی سی سے خبر سنی کہ امریکہ کے ایک شہر اکلاہاما میں ایک زور دار دھماکہ ہوا
جس کے نتیجے میں چھبیس افراد ہلاک ہوئے جن میں بچے بھی تھے۔ (بعد میں یہ تعداد زیادہ ہو گئی) سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ ان معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟ بچے مسلمانوں کے ہوں یا عیسائیوں کے' بچے بچے ہیں اور کیا
جس نے یہ دھماکہ خیز مواد رکھا تھا اسے اس کے ضمیر نے ملامت کیا ہو گا؟ کبھی نہیں! اس لئے کہ اس کا
ضمیر ایسا بنا دیا گیا ہے کہ اموات جتنی زیادہ ہوں گی اس کا ضمیر اتنا ہی زیادہ مطمئن ہو گا۔

دہلی میں ہندوستان کے ایک تاریخی گوردوارے میں جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ یہ گوردوارہ سکھوں کی بہت

بڑی عبادتگاہ ہے۔ بہت خوبصورت صاف ستھرا۔ پوری فضا خوشبو سے معطر۔ اس میں سیوا جی کے تبرکات بھی موجود ہیں۔ ہوا یوں کہ 1985ء میں ہندوستان گیا تو بچوں کے ساتھ تاج محل آگرہ دیکھنے گیا۔ واپسی پر دہلی میں چند دن قیام رہا۔ برسات کا موسم تھا۔ چاندنی چوک کے قریب سخت بارش سے پناہ لینے کے لئے ہم ایک "برساتی" کے نیچے کھڑے تھے۔ آپس میں پشتو بول رہے تھے۔ ایک سکھ میرے قریب آیا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بات کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ تقسیم ہند کے وقت وہ مردان کے ایک گاؤں میں آباد تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ میرا تعلق بھی مردان سے ہے۔ وہ ہمیں اپنے تاریخی گوردوارے کی سیر کے لئے لے گیا۔ ہم حسب معمول جوتوں کو ہاتھ میں اٹھائے گوردوارے کے اندر لے جانے لگے۔ اس خوف سے کہ مبادا کوئی جوتے چرا نہ لے۔ اندر سے دوڑتا ہوا ایک سکھ آیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا! سرکار! یہ مقدس جگہ ہے یہاں جوتا اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ اسے سامنے بنی ہوئی جگہ پر رکھیں۔ میں نے جواباً کہا۔ سرکار اگر یہ چوری ہو گئے تو پھر۔ (شاید اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ہم مسلمان ہیں) بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ معاف فرمایئے۔ یہ مسجد نہیں گوردوارہ ہے۔ آپ اسے جیسے رکھیں گے اس سے اچھی حالت میں پائیں گے۔ بعد میں موتی سنگھ نے مجھ سے معذرت کی۔ ہم واپس آئے تو تمام جوتے پالش شدہ پڑے تھے۔ قدرتی طور پر یہ سب کچھ دیکھ کر ضمیر نے مجھے ملامت کیا لیکن بات یہاں بھی ماحول کی تھی۔

اس قسم کی سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر اپنے ملک میں موجود کسی بھی بڑے شہر کی رواں دواں زندگی پر نظر ڈالئے۔ راہ جاتے ہوئے آپ کو ایسے سینکڑوں لوگ ملیں گے جو آپ کے ضمیر کے خلاف کام کر رہے ہوں گے لیکن انہیں ان کا ضمیر ایک لمحہ کے لئے بھی ملامت نہیں کر رہا ہو گا۔ مثلاً وہ دیکھیں! ایک شخص جا رہا ہے جس نے دس مرغیوں کو الٹا پکڑا ہوا ہے۔ اسے یہ احساس تک بھی نہیں کہ اس جاندار کو کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ اب اگر اس شخص کو پانچ منٹ کے لئے الٹا کر دیا جائے تو ساری زندگی اس کا ضمیر اسے اس غلطی کی اجازت نہیں دیگا۔

بچو! بچو! لگ گئی؟ نہیں بچ گیا ہوں۔ چلو اچھا ہوا۔ خیریت رہی۔ یہ ہر روز دیکھنے میں آتا ہے۔ پیچھے سے ایک شخص زخمی بیل کو ہانک رہا ہے۔ بیل کا کولہا زخمی ہے۔ ہانکنے والا اسی زخمی جگہ پر مضبوط سوٹی سے ضرب پر ضرب لگا رہا ہے۔ ہر ضرب سے زخمی بیل بدک جاتا اور راہ جاتے لوگوں سے بیل کی مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ صرف آپ کے ضمیر نے آپ کو متوجہ کیا۔ اسی طرح قوموں کے مجموعی ضمیر پر نظر ڈالئے۔ یورپی ممالک میں جنسی بدنہادی۔ سڑک کے کنارے بوس و کنار یا اسی قسم کی دوسری فحش

حرکات کرتے ہوئے ان کا ضمیر اس لئے ملامت نہیں کرتا کہ ان کا یہی ماحول ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں کوئی جوڑا اگر ایسا کرے تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائیگا کہ یہ ہمارے ماحول کا تقاضا ہے۔

ہمارے ہاں کے بچے جب کسی درخت کے نیچے کسی سوراخ کے راستے شہد کی مکھیوں کو آتے جاتے دیکھتے ہیں تو شہد حاصل کرنے کے لئے چھتے کے نزدیک آگ جلاتے ہیں یا کپڑ وغیرہ سے اس کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ تاکہ سب کی سب مکھیاں اندر ہی مر جائیں۔ گذشتہ دس سال سے میں یہی دیکھ رہا ہوں۔ میرے گھر کے نزدیک ایک درخت میں شہد کی مکھیاں ہر سال آتی ہیں اور ان کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔

پچھلے سال ناروے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک شام اکیلا منظور صاحب کے گھر سے باہر نکلا۔ شام کے دھندلکے چھا رہے تھے۔ ایک راستہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ میں اس پر ہو لیا۔ تھوڑی دور ایک خوبصورت سی جھیل تھی۔ آٹھ دس سال کے دو بچے جھیل کے کنارے نہ جانے کتنی دیر سے ایک بڑی چیونٹی کو پانی سے نکالنے میں مصروف تھے۔ میں نصف گھنٹے تک انہیں دیکھتا رہا۔ ساری دنیا سے بے خبر وہ اسی کام میں مصروف تھے۔ بہت سارے پتے رکھ کر انہوں نے سطح آب پر چیونٹی کے نکلنے کے لئے ایک عارضی پل بنا دیا' جس پر قدم بقدم چلتی بلکہ رینگتی ہوئی چیونٹی پانی سے باہر آگئی۔ جس پر وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ میں نے پیار سے ان دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انہیں شاباش دی۔

لیجئے ایک اور خبر سنئے۔ پاکستان میں مذہبی جماعتوں کے سربراہوں نے ایک مشترکہ ضابطہ اخلاق پر دستخط کر دیئے ہیں۔ (24 اپریل)۔ چلو اچھا ہوا۔ اب ان کا ضمیر انہیں فساد برپا کرنے کی اجازت نہیں دیگا۔ دیکھا آپ نے ضابطہ اخلاق وجود میں آنے سے ضمیر کے تقاضے بدل گئے۔ جو جرم پہلے گوارا تھا اب گوارا نہ رہا۔ حالانکہ چند دن کے بعد جب یہاں کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ملی یک جہتی کونسل کا اجلاس توہین رسالت کے قانون کے سلسلے میں ہوا تو اکثر مذہبی جماعتوں کے سربراہوں نے ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں اس لئے نہیں پڑھیں کہ ان کے ضمیر نے انہیں اجازت نہیں دی۔

ضمیر کو زندہ رکھنے یا اسے کسی اخلاقی معیار پر پرکھنے کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے' جو ہمارے ہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ تربیت تو بہت دور کی بات ہے۔ یہاں تو ایجوکیشن اور انفارمیشن کا فرق بھی واضح نہیں۔ کسی بچے کو یہ بتا دیا جائے کہ دنیا میں سات بڑے سمندر ہیں اور وہ یہ نہ جانتا ہو کہ سمندر ہے کیا چیز؟ اسے آپ نے انفارمیشن تو دے دی لیکن ایجوکیشن سے وہ محروم رہا۔ رہا تربیت کا معاملہ تو یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہمارے بچوں کی تربیت کا آغاز سڑک پر جانے والے گنے کے بھرے ٹرک سے گنا کھینچ کر گھر لانے سے ہوتا ہے اور اب تو ضمیر اس حد تک مردہ ہو چکے

ہیں کہ سڑک پر اگر کوئی خاتون یا کمزور شخص کیلے کے چھلکے پر سے پھسل جائے تو قرب و جوار میں کھڑے لوگ اس کی مدد کرنے کی بجائے اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بس یا گاڑی میں سوار ہوتے وقت ضعیف اور کمزوروں کے ساتھ ہونے والا سلوک تو ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔ آپ نے کبھی بس' ویگن' فلائنگ کوچ یا ٹرکوں کے ڈرائیوروں کو اکٹھے بیٹھ کر سنا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنی گاڑیوں کے نیچے انسانوں کے کچلے جانے کی کہانیاں مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ پٹھان ڈرائیور ایک دوسرے سے پشتو میں پوچھتے ہیں "تا سو کسان پہلے کڑی دی" تم نے کتنوں کو چپل بنا دیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ "دلس کسان" یعنی دس افراد کو کچل چکا ہوں۔ چھوڑو! تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ قہقہے لگتے ہیں۔ بزدلی کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ اگلی نشست تک وہ اپنا سکور بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی ان کا ضمیر ہے!

پٹھانوں کا ضمیر کبھی اسکی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کی موجودگی میں وہ ریح کا اخراج کریں بلکہ اگر کسی کو طعنہ دیا جائے تو بات قتل اور مقابلے تک پہنچ جاتی ہے' جبکہ دنیا میں موجود کئی معاشروں میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ بعض جگہ محفل میں ڈکار معیوب خیال کیا جاتا ہے جبکہ پٹھانوں میں سر محفل ڈکار لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مذہبی مخالفت کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل کر دینے کے باوجود قاتل کا ضمیر اس لئے مطمئن ہوتا ہے کہ وہ ایسے قتل کو اپنے لئے جنت کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ایسی سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے ثابت ہو گا کہ انسانی ضمیر کسی مستقل قدر کا نام نہیں۔ اس کا تمام تر دارومدار تعلیم و تربیت اور ماحول پر ہے۔ ویسے بھی ضمیر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں ہے اور نہ ہی اس حوالے سے کسی باز پرس کا اشارہ ملتا ہے۔ باز پرس اگر ہو گی تو اعمال کی ہو گی جو انسانی ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی ذات مرنے کے بعد صیقل شدہ ارتقاء کی اگلی صورت اختیار کرتی ہے۔ اعمال اگر قوانین خداوندی کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں تو انسان اس دنیا میں بھی سرخرو ہو گا اور بعد از مرگ بھی۔ ہم نے خدا کی طرف سے بھیجی گئی قوانین کی کتاب کو قرأت کے ساتھ پڑھنے تک محدود کر دیا ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ملک کے آئین کو کسی عدالت یا پارلیمنٹ میں ترنم کے ساتھ پڑھا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اس بات کا خیال ہو کہ ماحول سے زیادہ تعلیم کی کمی آڑے آرہی ہو۔ چلئے ایک چکر اس نگری کا بھی لگا لیتے ہیں جہاں نام سے پہلے "فاضل" نہ لکھنا سوئے ادب خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے ایسے کئی حج صاحبان سے شناسائی کا موقع ملا ہے۔ جو شراب اور شباب دونوں کے رسیا رہے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ رات انہوں نے کلب میں خوب پی اور صبح شراب نوشی کے مقدمے میں ایک غریب شخص کو قید کی سزا سنا دی۔ کیا انہیں ان کے ضمیر نے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں جھنجوڑا؟ اپنی عادت سے مجبور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہنے لگے۔

"قانون کی بالا دستی کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہئے۔ چور وہی ہے جو پکڑا جائے۔ چھپا چور بادشاہ ہوتا ہے" سچ کہا انہوں نے کیونکہ ان کے ماحول نے انہیں یہی سکھایا تھا۔

میں یہاں ایسی کئی مسجدوں سے واقف ہوں جہاں بجلی چوری کی جاتی ہے۔ چوری کی بجلی سے واٹر پمپ چلائے جاتے ہیں۔ پھر اس پانی سے وضو کیا جاتا ہے۔ پنکھے چلائے جاتے ہیں اور ان کی ٹھنڈی ہوا کے نیچے خطبہ سنا جاتا ہے۔ پنجگانہ نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ کسی نمازی کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ان مقربین خداوندی کو بجلی چوری کا احساس دلا سکے۔

اپنے ایک دوست کے ساتھ مجھے چینی انجینئروں کے ایک کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ان میں افسر بھی تھے اور ماتحت بھی لیکن سب ایک ہی کمرے میں مقیم! زاد راہ کا یہ عالم کہ ان کا ایک افسر بوتل میں قہوہ پی رہا تھا۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ ان کا مٹی کا پیالہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ دوسرا لانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے افسوس کیا تو فرمانے لگے ہم مزدور لوگ ہیں' آپ کی طرح مالدار نہیں۔ اب انہیں کون بتائے کہ تم غریب ہو کر بھی امریکہ سے ٹکر لئے ہوئے ہو اور ہم مالدار اس کے سامنے جھولی پھیلائے ہوئے اس سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ بات ہے اپنے اپنے ضمیر کی۔

ہم اپنے بچوں کو پڑھانے کی حد تک حضرت عمرؓ اور ان کے غلام کا شام کے سفر کا واقعہ جھوم جھوم کر سناتے ہیں۔ یہ بچے جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ششدر رہ جاتے ہیں کہ وہ کیا تھا اور یہ کیا ہے؟

خواتین لاکھ ننگے سر بیٹھی ہوں' اذان سنتے ہی ڈھلکے ہوئے دوپٹے سروں پر کھینچ لیتی ہیں۔ میں نے ایک خاتون سے پوچھا تو کہنے لگی "میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا کہ اذان کے دوران سر ننگا ہو"

مجھے ایسے سینکڑوں سرکاری ملازمین سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو رشوت لینا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں' لیکن اس کے باوجود ان سرکاری مراعات سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں جن کا انہیں اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً سرکاری گاڑی کا ناجائز استعمال' دفتر کی سٹیشنری کی چوری اور ٹیلی فون کا غیر قانونی استعمال۔ یہاں ایک بہت بڑے افسر نے تقریر کے دوران حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سرکاری لیمپ کو بجھا کر اپنا خط لکھنے کا واقعہ بڑے فخر سے سنایا اور اس کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ "اے اللہ ہمیں صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما" حاضرین نے بلند آواز میں آمین کہی اور پھر سب کے سب بمعہ اس افسر کے سرکاری گاڑیوں میں اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ یہ اور اس قسم کی تقریبات آپ بھی ہر روز دیکھتے ہوں گے۔ بات ہے ماحول کی۔

زندگی درحقیقت نام ہے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو بغور دیکھنے اور انہیں سمجھنے کا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جس کسی نے بھی ایسا کیا وہ دیوانہ کہلایا یا منکر حدیث۔ قرآن کے نزدیک جزا و سزا کا تعین اعمال پر ہو گا۔

اعمال چھوٹے ہوں یا بڑے' شخصی ہوں یا اجتماعی- اللہ کی میزان میں تلنے والی شے کا نام اعمال ہے وہاں نہ ضمیر کا پوچھا جائیگا نہ رسم و رواج کی تحقیق ہو گی-

مندرجہ بالا بحث سے صاف نظر آتا ہے کہ ہندوؤں کو مندر' عیسائیوں کو گرجا' سکھوں کو گوردوارہ اور مسلمانوں کو مسجد نہ جانے پر کوئی چیز ملامت کرتی ہے تو وہ اس مذہب کی تعلیم ہے نہ کہ قدرت کا دیا ہو اکوئی احساس- یہ احساس قدرت کا عطا کردہ ہوتا تو اس کے تقاضے جگہ جگہ مختلف نہ ہوتے- زندگی کا سفر دوری نہیں' ارتقائی ہے اور اس میں تگ و تاز کا مقصد مصیبتوں سے چھٹکارا پا کر یا آلائشوں سے پاک ہو کر پھر سے ویسا بن جانا (As You Were) نہیں' اس کا مقصد' بلند مقام حاصل کرنا ہے- قرآن نے انسانی زندگی کا مقصد نجات نہیں فوز قرار دیا ہے- قرآن کی رو سے انسانی ذات' ذات خداوندی کا جزو نہیں- (ذات ناقابل تقسیم وحدت ہوتی ہے' وہ اجزاء میں بٹ ہی نہیں سکتی)- یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ اگر کوئی جزو کسی سے الگ ہو جائے تو وہ چیز نامکمل ہو یا رہ جاتی ہے- خدا نے انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ذات عطا کی ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ اسے نشوونما دیتے ہوئے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے-

قرآن کریم نے انسان کی فوز و فلاح کے لئے جن چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے وہ ہیں اللہ پر ایمان' یوم آخرت پر ایمان اور اعمال صالح- آیت (2/62) ہی دیکھ لیجئے فرمایا-

> "کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ' یہودی ہوں یا نصرانی' صابی ہوں یا وہ لوگ جو بغیر رسمی گروہ میں داخل ہوئے ویسے ہی خدا کو مانتے ہیں---- یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے------- غرضیکہ کوئی بھی ہو' جو بھی خدا کے اقتدار اعلیٰ' زندگی کے تسلسل اور اس کے قانون مکافات پر اس طرح ایمان رکھے جس طرح قرآن میں بتایا گیا ہے اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے تو ان کے نشوونما دینے والے کے قانون مکافات کے مطابق' ان کا اجر ملے گا- نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامن گیر ہو گا' نہ حزن' وجہ افسردگی بنے گا"

آپ نے دیکھا یہاں نہ ضمیر کا ذکر ہے نہ ضمیر کی آبیاری کا---- حقیقت یہ ہے کہ احکام خداوندی سے کترانے کے لئے خدا کے ہنر مند بندوں نے جو راہیں تلاش کیں ان میں ایک ضمیر بھی ہے- یہودیوں- عیسائیوں اور ہندوؤں نے ایسی سینکڑوں اور اصطلاحات بھی ایجاد کی ہیں جو کسی نہ کسی راستے مسلمانوں میں بھی در آئی ہیں اور مسلمان ان اصطلاحات کو باضابطہ طور پر اپنی اقدار یعنی Values میں شامل کر چکے ہیں- مختصر

الفاظ میں ضمیر ان بے شمار خداؤں میں سے ایک ہے جو ہم نے از خود اپنے اوپر مسلط کر رکھے ہیں' ہماری مشکل یہ ہے کہ آج ہم بہت کچھ اس لئے بھی نہیں کر پاتے کہ ہمارا ضمیر اس سے ابا کرتا ہے اور ضمیر سے چھٹکارا پانا اس لئے ناممکن ہے کہ ہمارا مقامی ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ماحول میں یکسانیت پیدا کرنا اس لئے ممکن نہیں رہا کہ مستقل اقدار خداوندی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ علاج اس کا؟

علاج اسکا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعۃ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ' مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ :

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر' بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون : کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

حبیب الرحمان خان
انسپکٹر جنرل پولیس (ریٹائرڈ)

قرآنی معاشرہ میں جرم، مجرم، سزا اور اسلامی ریاست کا باہمی تعلق!

خالق کائنات کی طرف سے انسانی معاشرتی زندگی کو خوبصورت بنانے کے لئے جو آخری ضابطۂ اقدار و ہدایت عطا کیا گیا ہے اس میں جرم، مجرم، سزا اور معاشرہ کا باہمی تعلق منفرد اور اپنی نوعیت میں نہایت ممتاز ہے۔ اس موضوع پر پرویزؒ صاحب کی قرآنی فکر سے استفادہ کرنے والے قرآن کریم کے ایک طالب علم نے 1979ء میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو روزنامہ مشرق کی 10 فروری کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت مقالہ نگار پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ اس مقالہ کو ہم طلوع اسلام کے صفحات میں شائع کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ 1979ء میں لکھے گئے اس مقالہ کے مندرجات سے یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آئے گی کہ قرآنی اصول و اقدار کس طرح زمان و مکان کی حدود و قیود سے ماوراء ہیں۔ (مدیر)

نظامِ مصطفیٰؐ کا چرچا تو ایک عرصہ سے ہو رہا ہے لیکن چونکہ اس کا کوئی واضح اور متعین مفہوم سامنے نہیں لایا گیا، اس لئے ہر شخص اپنے اپنے ذہن میں اس کا الگ الگ نقشہ مرتب کرتا ہے جس سے طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر چونکہ ملک میں قانون شکنی کے موجودہ رجحانات کے پیش نظر اس کا آغاز تعزیرات یعنی سزاؤں سے متعلق قوانین سے کیا جا رہا ہے اور یہ سزائیں مروجہ سزاؤں کے مقابلہ میں زیادہ سخت دکھائی دیتی ہیں، اس لئے سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ نظام سنگین سزاؤں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ تمام شکوک و شبہات عدم واقفیت یا غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ یہ نظام اس خدا کا عطا فرمودہ ہے جس نے اپنی کتاب عظیم کے افتتاحیہ کی پہلی آیت میں اپنا تعارف "رب العالمین اور الرحمٰن الرحیم" کی صفات سے کرایا ہے اور جس کا قیام اس ذاتِ گرامی کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا جسے خدا نے "رحمتہ للعالمین" کہہ کر پکارا ہے۔ اس

لئے یہ نظام تو سرتاپا رحمت ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک عملی نظام ہے اس لئے وہ رحمت کے بھی جذباتی پہلو کے مقابلے میں عملی پہلو کو ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ مثلاً سزاؤں کے سوال ہی کو لیجئے۔ ظالم کو اس کے ظلم کی جو سزا ملتی ہے وہ نہ صرف متعلقہ مظلوم کے حق میں بلکہ سوسائٹی کے حق میں بھی رحمت ہوتی ہے۔ رحمت ہی نہیں بلکہ قرآن کریم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "اے ارباب فکر و بصیرت! اگر تم غور کرو گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دینے میں معاشرے کی زندگی کا راز مضمر ہے"۔ (2/179)۔ مجرم کو اس کے جرم کی کماحقہٗ سزا دینے کو عدالتی عدل کہا جاتا ہے۔ میں اس مختصر سے مضمون میں قرآن مجید کی روشنی میں اس نکتے کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

مساواتِ انسانیہ کے سلسلے میں قرآنِ مجید کا بنیادی اصول یہ ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ان کے انسان ہونے کی بناء پر یکساں واجب التکریم بنایا ہے" (17/70)۔ مجرم بھی ایک انسان ہوتا ہے جس سے ایک لغزش سرزد ہوتی ہے۔ اس لغزش کی وجہ سے وہ شرفِ انسانیت سے محروم نہیں ہو جاتا' اس لئے عدل کی نگاہوں میں وہ ذلیل نہیں قرار پا سکتا۔ قانون کا تعلق اس کی لغزش سے ہوتا ہے۔ اس کے شرفِ انسانیت سے نہیں۔ جس طرح بیمار اپنی بیماری کی وجہ سے تکریمِ انسانیت سے محروم نہیں ہو جاتا' اس طرح مجرم اپنی لغزش کی وجہ سے انسانی حقوق سے محروم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ قرآنِ مجید ارتکابِ جرم کی علت کو محض نفسیاتی مرض قرار دیتا ہے۔

عدل کے متعلق متفقہ مفہوم یہ ہے کہ جو فیصلہ مروجہ قوانین کے مطابق ہو اسے عدل کہا جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ قوانین ہی عدل و انصاف پر مبنی نہ ہوں' تو ان کے مطابق فیصلے کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ قوانین کے معاملے میں قرآن ایک ایسا اصول پیش کرتا ہے جس کی رو سے اس کا نظام منفرد قرار پا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین میں شعوری یا غیر شعوری طور پر انسانی مفاد پرستی کی آلائش ضرور آجاتی ہے' اس لئے وہ قانون سازی کا اختیار انسانوں کو دیتا ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے (12/40) جو انسانی جذبات سے مبرا اور تمام نوع انسان کے حقوق کا محافظ ہے۔ اس کے یہ قوانین اس کی آخری کتاب قرآنِ مجید میں محفوظ ہیں۔ ان قوانین کے مطابق فیصلوں کو عدل کہا جائے گا۔ اس بناء پر خدا نے کہا ہے "اور ہماری مخلوق میں وہ لوگ بھی ہیں جو ہماری نازل کردہ وحی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کے مطابق عدل کرتے ہیں" (7/181)۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ قانون سازی کا اختیار کسی انسان کو حاصل نہیں' یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ نقطہ وضاحت چاہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قوانین جزئیات سمیت

مرتب کر کے اپنی کتاب قرآن مجید میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ قرآن مجید اس قسم کے تفصیلی قوانین کا مجموعہ نہیں۔ جس کتاب کو تمام نوعِ انسان کے لئے اور قیامت تک کے لئے ضابطۂ ہدایت قرار پانا تھا' اس میں بیک وقت اور ہمیشہ کے لئے تمام قوانین دیئے ہی نہیں جا سکتے تھے۔ قرآن کریم نے چند ایک احکام کو چھوڑ کر زندگی کے باقی گوشوں کے لئے بنیادی اصول اور مستقل اقدار عطا کئے ہیں' انہیں وہ حدود اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اسلامی نظام ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق تفصیلی قوانین اور احکام خود مرتب کرتا ہے۔ مثلاً اس نے سیاسی نظام کے سلسلے میں اصول دیا ہے کہ "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے" (42/38)۔ یعنی اس نے اصول یہ دیا ہے کہ یہ نظام مشاورتی ہو گا۔ لیکن اس کی شکل و صورت کیسی ہو گی' اسے خود متعین نہیں کیا بلکہ اسلامی مملکت اپنے حالات کے مطابق اس کی عملی شکل خود متعین کرے گی۔ یہ اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا' لیکن مشاورتی نظام کی ہیئت' ضرورت کے مطابق بدلتی رہے گی۔

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر قانون پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت تبدیل کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ قانون اور اختیار کا منبع وہاں کی پارلیمنٹ ہوتی ہے جو عوام کی منتخب ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ (خداوند کریم) کو حاصل ہے اس لئے اس کا عطا کردہ قانون کسی ملک کی دو تہائی اکثریت تو کجا' پوری دنیا بھی اس کی کسی ایک شق کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ باالفاظ دیگر وہ بنیادی حقوق جو اللہ کے عطا کردہ ہیں' انہیں کوئی انسان نہ سلب کر سکتا ہے اور نہ معطل۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اسلامی نظام میں عدل اسے کہا جائے گا جو قرآن مجید میں بیان کردہ احکام یا اصولوں کے مطابق ہو۔ اس باب میں قرآنِ مجید ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ قوانین کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں جو شخص ان قوانین کے مطابق فیصلے کرتا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ ان فیصلوں میں اس کے ذاتی رجحانات' میلانات اور جذبات کو کوئی دخل نہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ مثال کے طور پر اپنے ایک اولوالعزم رسول کو مخاطب کر کے کہتا ہے "اے داؤد! ہم نے تمہیں مملکت میں صاحبِ اقتدار بنایا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ تم لوگوں کے نزاعی امور کے فیصلے الحق کے مطابق کرو اور ایسا کرنے میں اپنے جذبات اور رجحانات کو مؤثر نہ ہونے دو" (38/26)۔

انسان کے ذاتی جذبات کے متأثر ہونے کا سب سے قوی اور شدید مقام وہ ہوتا ہے جہاں کوئی دشمن سامنے ہو۔ عداوت کا جذبہ شدید ترین ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کا اس باب میں ارشاد ہے "کسی قوم کی دشمنی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کیونکہ عدل تقویٰ کے

قریب تر ہے" (5/8)- عدل کے لئے صحیح فیصلے کی بنیاد گواہیوں پر ہوتی ہے- گواہی یا شہادت کے معاملے میں قرآنِ کریم نے جو اصول یا معیار مقرر کیا ہے' اگر دنیا آج اس پر عمل پیرا ہو جائے تو ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ ہو جائے- اس نے سورۃ النساء کی آیت 135 میں کہا ہے :-

"اے جماعت مومنین ! تم دنیا میں عدل قائم کرنے کے ضامن بن کر رہو- تمہیں اگر کسی معاملے میں شہادت دینی ہو' تو نہ مدّعی کی طرف سے شہادت دینے جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے' تم خدا کی طرف سے مقرر کردہ گواہ کی حیثیت سے پیش ہو اور سچی سچی گواہی دو' خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے ماں باپ یا دیگر اقربا کے خلاف- نہ ہی تم یہ دیکھو کہ فریقین میں سے کون غریب ہے اور کون امیر- تمہاری نسبت' خدا ان کے حقوق کا زیادہ محافظ ہے- تم عدل کرنے میں اپنے جذبات اور میلانات کو دخل انداز مت ہونے دو- نہ ہی کوئی ذو معنی پیچ دار بات کہو اور نہ ہی سچی گواہی دینے سے اعراض برتو- غرضیکہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ جس خدا کی طرف سے تم گواہ بن کر پیش ہو رہے ہو وہ تمہاری ہر بات سے واقف ہے"- (4/135)

قرآنِ کریم نے یومِ قیامت کے محاسبے کو بہترین عدالت کے ماڈل کے طور پر پیش کیا ہے- اس کی تفصیلات تو بہت طویل ہیں لیکن اس میں جو اصول پیش کئے گئے ہیں انہیں دو تین مقامات پر نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ :-

"فیصلے کے دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکے گا' نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی' نہ ہی کسی کو کچھ لے لوا کر چھوڑ دیا جائے گا اور نہ ہی کوئی شخص مجرم کی مدد کر سکے گا"- (2/48)

متعدد بار کہا گیا ہے کہ اگرچہ فیصلہ کرنے والا خدا انسانوں کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے' لیکن اس کے باوجود اس کی عدالت میں ہر ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا- مقدمہ کی کاروائی جس قدر کھلی کھلی اور واضح ہو گی' اسے سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ جوں جوں نگاہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے' خود عدل کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے- اس نے کہا ہے کہ یوں سمجھو کہ ہر مجرم کے جرائم کی دستاویز اس کی گردن کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے- فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ وہ پہلے لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور عدالت میں اسے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اسے تم خود ہی پڑھو اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کرو کہ تمہیں اس جرم

کی کیا سزا ملنی چاہئے۔ (17/13-14)

اس قسم کا ہو گا نظامِ مصطفیٰؐ میں عدالت کا منظر۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ اثبات جرم کے باوجود اگر عدالت دیکھے کہ مجرم اپنی لغزش پر نادم اور پریشان ہے اور اس میں اصلاح کی صلاحیت ہے تو اسے اپنی اصلاح کرنے کا موقعہ بہم پہنچائے۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ اسلامی نظام میں قانون کی بالا دستی اور عدل کی کارفرمائی سے مقصد معاشرہ کو قانون شکنی کے خطرات سے محفوظ رکھنا اور جس سے لغزش سرزد ہو گئی ہو اس کی اصلاح کے لئے مواقع بہم پہنچانا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے وہ عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ کسی میں جو کمی واقع ہو گئی ہو' اسے پورا کر کے اس کا توازن قائم کر دینا۔ صرف عدل کے ساتھ انصاف کے سبب جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اسے ایک دو مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک شخص کے ہاں چوری ہو جاتی ہے۔ پولیس مجرم کو گرفتار کرتی ہے۔ عدالت اسے قانون کے مطابق سزا دے دیتی ہے۔ اس سے عدل کا تقاضا تو پورا ہو گیا لیکن جس کا مال چوری ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے اس کی معاشی زندگی میں کمی واقع ہو گئی تھی اس کی کمی تو پوری نہ ہوئی۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا یہ فریضہ ہے کہ اس کی اس کمی کو بھی پورا کرے۔ اسلامی نظام میں یہ معاملہ چور اور جس کے ہاں چوری ہوئی ہے ان کے مابین نہیں رہتا۔ جس کے ہاں چوری ہوئی ہے اس کا معاملہ حکومت کے ساتھ ہوتا ہے اور حکومت کا معاملہ چور کے ساتھ۔ حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اس مدعی کی کمی کو پورا کرے۔ اس کمی کی ایک اور مثال لیجئے۔ مجرم کو جیل خانے بھیج دیا جاتا ہے اور اس کے بال بچے جن کی روزی کا وہ کفیل تھا، نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو جاتے ہیں' حالانکہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہوتا۔ ان کی کفالت اسلامی نظام کی ذمہ داری ہو گی۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ نظامِ عدل اور جزا و سزا کے قرآنی فلسفہ کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے وقت چاہئے۔ البتہ ایک سوال ایسا ہے جو مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے' اگرچہ اس کی وضاحت میں کافی وقت چاہئے لیکن میں ایک آدھ مثال سے بات واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ قرآنِ حکیم اس حقیقت کو بنیادی طور پر واضح کرتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا اثر دوسرے فرد یا فریقِ معاشرہ یا حکومت پر جو پڑتا ہے اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا' لیکن اس کا اثر خود مجرم کی اپنی ذات پر بھی پڑتا ہے اور یہ اثر سب سے گہرا ہوتا ہے اور سب سے زیادہ نقصان دہ بھی۔ مجرم کو سزا عدالت کی طرف سے ملتی ہے اس سے یہ اثر زائل نہیں ہو سکتا' اسے اس مجرم کو خود ہی زائل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے زائل کرنے کا طریقہ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ اس کے اس جرم سے جو تخریبی نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اچھے اور تعمیری کام کر کے تخریبی نتائج زائل

کر سکتا ہے (11/114)۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اپنی ذات پر یہ اثرات لئے ہوئے قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اس کی سزا کیسے پاتا ہے' میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عدالت کی طرف سے دی گئی سزا سے انسان اپنے جرم کے اس نقصان سے نہیں بچ سکتا جو اس کی اپنی ذات پر وارد ہوا ہے۔ اسے ایک محسوس مثال کی رو سے سمجھئے۔ ایک شخص کہیں سے گھی کا ٹین چراتا ہے جو زہر آلود ہے۔ وہ چوری کے جرم میں پکڑا جاتا اور سزا پاتا ہے۔ اس سزا کے اس زہر کا اثر زائل نہیں ہو سکتا جو اس زہر آلود گھی کے کھانے سے اس کی صحت پر پڑا تھا۔ اس کا ازالہ اسے مناسب علاج سے کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس کا علاج نہیں کرتا تو اس کی سزا ضرور پاتا ہے۔ **حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والوں کا یہی ایمان ہے جو انہیں ارتکابِ جرم سے باز رکھتا ہے۔ نظام مصطفیٰؐ کی بنیاد ہی اس ایمان پر ہے۔ اسے خدا کا قانون مکافات عمل کہا جاتا ہے۔**

چند اشعار - دیار غیر سے

اگرچہ مال و زر حاجت روا ہے
قناعت بھی متاع بے بہا ہے
نہ میں شیعہ' نہ سنی' نہ وہابی
میں مسلم ہوں مرا آئیں جدا ہے
مری قرآن خوانی سے بزرگو
بھلا مردوں کو کیسا فائدہ ہے
جو بوؤ گے یہاں کاٹو گے آگے
یہی ہو گا یہی ہوتا رہا ہے
تو رکھ فاروق ان لوگوں سے ناطہ
کہ جنکے دل میں کچھ خوف خدا ہے

فاروق احمد (کلیو لینڈ)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ترتیب و پیشکش محمد عمر دراز

شاہکارِ رسالت مآبؐ ۔ حضرت عمر فاروقؓ

حضور نبی اکرمؐ نے اپنی بے مثال تعلیم و تربیت سے قدوسیوں کی ایک جماعت تیار فرمائی اور ان کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔ آپؐ کی تشریف براری کے بعد' اس مملکت کی سربراہی حضرت صدیق اکبرؓ کو تفویض ہوئی لیکن ایک تو ان کا زمانۂ خلافت بہت مختصر تھا (قریب اڑھائی سال) اور دوسرے' ملک کے اندر مختلف بدوی قبائل نے جو شورش برپا کی تھی' آپ کا زیادہ وقت اس کے فرو کرنے میں صرف ہو گیا۔ بنا بریں' اس نظام کی تکمیل (جو قرآن پیش کرتا ہے) ان کے عہد میں بھی نہ ہو سکی۔ اگرچہ جو فریضہ انہوں نے ادا کیا (یعنی استحکام مملکت) وہ بجائے خویش بڑا وقیع اور مستحق ہزار تبریک و تحسین ہے۔ آپ کی عظمت اس کارنامۂ عظیم میں ہے کہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اسلامی مملکت کی حدود قریب قریب وہی تھیں جو حضورؐ کے عہد ہمایوں میں شکل پا گئی تھیں' اور آپ نے فتنہ ہائے ارتداد و مانعینِ زکوٰۃ کو فرو کر کے اسلامی مملکت کی حدود میں کمی نہ کرنے دی۔

قرآنِ کریم کے اصول و اقدار کے مطابق انسانی معاشرہ یا نظامِ مملکت' اپنی پوری تفاصیل کے ساتھ عہدِ خلافتِ فاروقِ اعظمؓ میں نظر آتا ہے جنہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور کسب فیض کے اس معراج کے بل بوتے پر جو آپ نے نبی اکرمؐ کے دستِ مبارک سے حاصل کیا' سیاسی' معاشی' معاشرتی اور مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کے گوشوں میں باریک سے باریک تفصیلات کے ساتھ اسلامی مملکت میں قرآنی نظام نافذ و جاری کیا۔ اس حیات افروز دور کی تفصیلات' مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی معرکہ آراء تصنیف "شاہکار رسالت" کے مطالعہ سے ہی سامنے آسکتی ہیں۔

ہم ذیل میں دنیا کے اس عظیم منتظم (Administrator) اور قرآنِ کریم کے لائقِ صد رشک و تقلید خادم کی زندگی سے ان کے وہ اقوال پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جنہیں "شاہکارِ رسالت" میں 'بزم انجم' کے عنوان کے تحت محفوظ کر دیا گیا ہے اور جو ہر طالب علمِ قرآن اور قرآنی نظام کے نفاذ کی جستجو رکھنے والے قلب کے لئے عظیم تر نشانات راہ ہیں۔ کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کے تمام تر کمالات دستِ نبویؐ کی

صورت گری کے رہین منت ہیں۔ یہ تمام اقتباسات "شاہکار رسالت" سے لئے گئے ہیں۔

1- **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه** (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے)۔ (چوتھا باب)

2- خدا نے کائنات تمہارے لئے پیدا کی اور تمہیں اپنے لئے۔ (چوتھا باب)

3- خدا انسانوں کو براہ راست رزق نہیں دیتا۔ انسانوں کے ذریعے دیتا ہے۔ (چوتھا باب)

4- متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر خدا کے قانون زراعت پر بھروسہ کرتا ہے۔ (چوتھا باب)

5- **اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِالْقُرْاٰنِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِالْقُرْاٰنِ اٰخَرِيْنَ** (چوتھا باب)

6- محض لا الٰہ کہہ دینے سے جنت نہیں مل سکتی۔ جنت عمل سے ملتی ہے۔ (چوتھا باب)

7- کسی قوم سے مقابلہ کے وقت یہ نہ دیکھو کہ اس کی اخلاقی خرابیاں تمہاری خرابیوں سے زیادہ ہیں۔ دیکھو یہ کہ تمہاری اخلاقی خوبیاں اس سے کتنی زیادہ ہیں۔ یہ ہے کامیابی کا راز! (پانچواں باب)

8- اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے' تو یہ دیکھو کہ خدا کی مخلوق تمہیں کیسا سمجھتی ہے! (پانچواں باب)

9- جب حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔ (پانچواں باب)

10- مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔ (چھٹا باب)

11- ہماری عزت و عظمت اسلام کے صدقہ میں ہے' اس لئے سب تعریف و ستائش اسی کی ہونی چاہئے نہ کہ ہماری۔ (چھٹا باب)

12- خلافت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو حساب دیتے وقت بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔ اگر یہ جواب اطمینان بخش ہے تو وہ خلافت ہے' ورنہ ملوکیت۔ (ساتواں باب)

13- کسی کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ باہمی معاملات میں کھرا ثابت ہو' نہ کہ وہ جو نمازیں بہت پڑھتا ہو۔ (ساتواں باب)

14- بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی۔ سزا اسے دی جائے گی جس نے اسے اس حالت تک پہنچایا (حاطب ابن بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ) (ساتواں باب)

15- اگر کسی کی وجاہت کے خیال سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے تو خدا کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟۔ (ساتواں باب)

16- لوگوں کو ان کی مائیں آزاد جنتی ہیں' انہیں غلام بنانے کا کسی کو حق نہیں۔ (ساتواں باب)
17- جب تک سربراہ مملکت پر وہی کچھ نہ گزرے جو رعایا پر گذرتی ہے' اسے ان تکالیف کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ (آٹھواں باب)
18- اللہ تعالیٰ' حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نت نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے حل کے لئے جدید قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔ (نواں باب)
19- حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو جائے تو انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔ (نواں باب)
20- طاقت ور فاسق اور کمزور دیانت دار' دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ (نواں باب)
21- جس کے دل میں اپنی اولاد کے لئے محبت نہیں وہ رعایا کے لئے شفیق کس طرح ہو سکتا ہے؟ (نواں باب)
22- جو شخص خود کسی منصب کا خواہش مند ہو' اسے اس پر تعینات نہیں کرنا چاہئے۔ (نواں باب)
23- رعایا اس وقت تک اپنے حاکم کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا رہتا ہے۔ جب وہ فسق و فجور میں پڑ جاتا ہے تو رعایا اس سے بھی زیادہ فاسق و فاجر ہوجاتی ہے۔ (نواں باب)
24- وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔ (نواں باب)
25- ایک گورنر کو لکھا کہ تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعیت ہوتے تو چاہتے کہ ہمارا امیر ایسا ہونا چاہئے۔ (نواں باب)
26- گورنر کو لکھا کہ ایسا بن کر رہو کہ امن پسند تجھ سے بے خوف اور بدقماش خوفزدہ رہیں۔ (نواں باب)
27- جو شر پیدا کر کے غالب آیا' وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جو ناجائز طریق سے کامیاب ہوا' وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔ (نواں باب)
28- جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے' وہ ناقابل شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار نہیں۔ اس کا مطلب حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے۔ (نواں باب)
29- جو شخص مسلمانوں کا امیر بنے' اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلاموں کی طرح مخلص اور امین ہو۔ (نواں باب)
30- جس میں تکبر دیکھو' سمجھ لو کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ (نواں باب)

31- جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں' وہ قصرِ سعد نہیں' قصرِ فساد ہے۔ (نواں باب)

32- مرد کا حسب' اس کا دین' نسب اس کی عقل اور مردانگی اس کا حسنِ خلق ہے۔ نکاح کے رشتوں کے لئے یہ خوبیاں تلاش کرو۔ (دسواں باب)

33- ازدواجی زندگی میں تصوراتی معیار (Idealism) کام نہیں دیتا۔ اس میں لچک رکھنے کی ضرورت ہے۔ (دسواں باب)

34- دنیا کی سب سے بڑی مصیبت کم مال اور کثرتِ عیال ہے۔ (دسواں باب)

35- جوانوں سے کہا کہ جوانی کے زمانہ میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہِ ندامت نہ ہو۔ (دسواں باب)

36- کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اسے غصہ کی حالت میں نہ آزما لو۔ (دسواں باب)

37- کسی شخص کے لئے رسوا کن الفاظ استعمال نہ کرو۔ (دسواں باب)

38- فیصلہ باطن کی پاکیزگی کے دعویٰ کے مطابق نہیں ہو گا' ظاہر اعمال کی رُو سے ہو گا۔ (دسواں باب)

39- وعظ سے بچو' اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ (دسواں باب)

40- انسان کو چاہئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آئے تو مرد بن جائے۔ (دسواں باب)

41- امیر المومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ (گیارہواں باب)

42- خدایا اس قوم کا حشر کیا ہو گا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔ (گیارہواں باب)

43- رعایا پر حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے' جب وہ حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو جائے۔ (گیارہواں باب)

44- لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو۔ مٹھی مٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔ (گیارہواں باب)

45- خدا نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعائیں اس تک نہ پہنچنے دوں۔ (بارہواں باب)

(اس کی تشریح میں فرمایا کہ تم خدا سے اس وقت دعا کرو گے جب تمہاری کوئی ضرورت رک جائے۔ میں ایسا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہوں کہ تمہاری کوئی ضرورت رکنے نہ پائے)۔

46- حکومت کی اصلاح تین باتوں سے ہو سکتی ہے۔

امانت (ذمہ داریوں کی ادائیگی)۔ قوت کے ساتھ گرفت اور قرآن کے مطابق فیصلے اور دولت کی اصلاح دو چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ حق کے ساتھ لیا جائے اور باطل میں صرف ہونے سے بچایا جائے۔ (تیرہواں باب)

47- ہم انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا حکم خدا نے دیا ہے' اور انہی سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔ (تیرہواں باب)

48- جس نے اپنی مدد کے لئے "فلاں خاندان" کہہ کر آواز دی' سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اسلام کے بعد قبائلی اور خاندانی تفریقات ختم ہو جاتی ہیں۔ (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نام خط)

قادسیہ کی فتح کی خبر سننے کے بعد آپ نے تقریر فرمائی کہ :-

"بھائیو ! میں بادشاہ نہیں کہ تم کو اپنا غلام بنانا چاہوں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا فریضہ میرے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر میں اس فریضہ کو اس طرح انجام دوں کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں اطمینان کی زندگی بسر کرو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دیا کرو تو یہ میری انتہائی بدبختی ہو گی۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں اور نصیحت بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن صرف قول سے نہیں۔ عمل سے بھی۔

مدائن کی فتح کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ :-

"آج مجوسیوں کی حکومت فنا ہو چکی۔ اب وہ اپنے ملک میں بالشت بھر زمین کے بھی مالک نہیں ہو سکیں گے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں۔ مسلمانو ! خدائے تعالیٰ نے تمہیں مجوسیوں کی زمین' مجوسیوں کی سلطنت' مجوسیوں کے اموال و املاک کا مالک بنایا ہے۔ تاکہ اب تمہارے اعمال و افعال کو جانچے۔ پس تم اپنی حالت نہ بدل لینا۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو خدا تم سے بھی حکومت چھین لے گا اور کسی دوسری قوم کو دے دے گا۔"

یہ آپ کی آخری نصیحت تھی۔ اس کے چند روز بعد' آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور آئے ! ابدی حقائق کے ان گل ہائے شاداب کو اپنے دامن میں لئے' ہم بھی اس حسین و جمیل محفل سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوں کہ

ابدی باد بہار تو کہ درا انجمنت
کف خاک آدم و جوش بہاراں رخیتم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

صابر صدیقی

مسلمانوں میں علمی تحریک

ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا میں علم کے چار مرکز تھے۔ ہندوستان، چین، ایران اور یونان۔ لیکن پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے بعد ایک سو سال کے اندر اندر جب مسلمان ایشیا اور شمالی افریقہ کے اکثر علاقوں پر چھا گئے تو انہوں نے مختلف علوم کے دھاروں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ 832ء میں خلیفہ المامون نے بغداد میں بیت الحکمت کی بنیاد رکھتے ہوئے اس میں ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا جہاں دنیا بھر کے علوم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اسی بیت الحکمت کے ساتھ مامون الرشید نے مشاہدہ و مطالعہ افلاک کے لئے ایک رصد گاہ بھی تعمیر کروائی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے علمی ذوق نے ستاروں پر بھی کمند ڈالنا شروع کر دی تھی۔ اس رصد گاہ کی تعمیر سے پہلے عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں الحجاج ابن یوسف اور اس کے بعد ابو یحییٰ الجطی کو عربی میں منتقل کر کے لوگوں کی آنکھیں سوئے افلاک لگا چکے تھے اور مسلمانوں میں جستجوئے علم کا جذبہ شدت سے ابھر کر جنگل کی آگ کی طرح پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے بڑی تیزی سے ایران، یونان اور ہندوستان کے علمی خزانوں کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ مشہور مورخ "حتی" (HITTI) کے قول کے مطابق یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب یورپ پر جہالت کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ہارون الرشید اور مامون الرشید فارس کے فلسفہ کی چھان بین کر رہے تھے تو یورپ میں ان کے ہم عصر شارلیمان اور اس کے عمائدین حروف تہجی سیکھنے میں مشغول تھے۔

الغرض مسلمان علم و دانش سمیٹنے کے بعد اس کی ترویج و اشاعت پر کمر بستہ ہو گئے اور دنیائے اسلام میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے علمی مراکز قائم ہونے لگے۔ علم الافلاک میں دلچسپی کی وجہ سے خاصی تعداد میں رصد گاہیں بھی تعمیر ہو گئیں جن سے فلکیات کی درسگاہوں کا کام لیا جاتا تھا۔ نویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مامون الرشید کے ایما پر مشہور جغرافیہ دان الخوارزمی اور اس کے شرکاء نے دنیا اور اجرام فلکی کے نقشے تیار کئے اور سنجر کے میدان میں خط نصف النہار کے ایک درجے کی پیمائش بھی کی۔ ان کے حساب سے یہ طول ساڑھے چھپن میل نکلا جو صحیح طول سے صرف 959 گز زیادہ ہے۔ اس حساب سے زمین کا محیط

بیس ہزار میل اور قطر چھ ہزار میل ٹھہرتا ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ تجارب اس وقت کئے جا رہے تھے جب یورپ بطلیموسی نظام سے بے خبر زمین کے چپٹی ہونے کا قائل تھا۔ مسلمانوں نے دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ علم ہیئت پر کافی توجہ دی۔ جب وہ ہندوستانی زیچوں سے روشناس ہوئے تو خلیفہ المنصور کے فرمان سے دنیائے اسلام کے پہلے نامور ماہر علم الافلاک الفزاری نے 796ء اور 806ء کے درمیان ہندوستانی زیچوں کی کتاب سدھانت کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد خلیفہ مامون الرشید کے فلکیوں کی جماعت کے رئیس الخوارزمی نے الفزاری کے ترجمہ کی بنیاد پر اپنی فلکیاتی زیچیں مرتب کیں اور ہندوستان اور یونان کے فلکیاتی نظاموں کو مربوط کر کے ان پر اضافے بھی کئے۔ اس زمانے میں بغداد کی تین رصد گاہوں کے علاوہ دنیائے اسلام میں رے، شیراز، نیشا پور، سمرقند، جندی پور، اشبیلیہ، مراغہ، واسط، لپامیہ، مصر اور کئی دوسرے مقامات پر بھی رصد گاہیں تعمیر ہوئیں۔ رے کی رصد گاہ میں الخازن نے مدار شمسی کے میل کلی کی تحقیق کی۔ احمد النہاوندی (المتوفی 825ء یا 845ء حبش بن الحاسب (المتوفی 831ء) یحییٰ ابن ابی منصور 870ء تا 970ء) نائریزی (المتوفی 932ء) البجریطی (1029ء تا1087ء) خوشیار (المتوفی 1029ء) الزرقالی اور نصیر الدین طوسی نے اپنے اپنے زمانے میں نئے طریقوں سے جدید زیچیں مرتب کیں۔ الزرقالی نے کسوف شمسی کے متعلق اپنی توضیح میں دنیا کو پہلی مرتبہ سطح بحر سے بلندی کے ذریعہ تعین وقت کے طریقہ سے روشناس کرایا۔ اس نے ایک جدید قسم کا اصطرلاب بھی بنایا اور اوج شمسی بلحاظ کواکب کی حرکت کو ثابت کیا۔ اس کے حساب سے اس اوج کی پیائش 1204ء تھی جبکہ صحیح پیائش 1108ء ہے۔ موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں نے مدار شمسی کے میل کلی کو دریافت کیا اور انہوں نے سب سے پہلے اعتدال لیل و نہار اور حرکت اوج شمسی کے مشاہدے کئے جن سے اہل یونان ابھی تک ناواقف تھے۔ الکوہی نے اعتدال ربیعی اور اعتدال خریفی کی دریافت کی اور بو معشر 776ء تا 886ء نے مدو جزر کے قوانین معلوم کئے جو حرکت قمری بلحاظ ارض پر مبنی تھے۔ البتانی (المتوفی 929ء نے بطلیموسی نظام میں بہت سی ترمیمیں کیں اور چاند اور بعض سیاروں کے مدار کے احصاء کی غلطیاں بھی دور کیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ سورج گرہن ایک سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ بھی لگ سکتا ہے۔ اسی نے مدار شمسی کے میل کلی اور اعتدال ربیعی کے طول اور سورج کے حقیقی اور اوسط مدار کا بڑی صحت کے ساتھ تعین کیا۔ علی بن یونس المتوفی 1009ء نے زیچ الاکرب الحاکمی لکھی جو بطلیموس کی المجسطی سے بہتر تھی۔ ان کے علاوہ سند بن علی، یحییٰ ابن ابی منصور اور خالد بن عبدالمالک نے اعتدال لیل و نہار، شہاب ثاقب اور دیگر اجرام فلکی کی نور پیائی کے متعلق نہایت اہم مشاہدات کئے۔ البیرونی (المتوفی 1048ء) نے زمین کی محوری گردش کے نظریہ پر بحث کی اور طول بلد اور عرض بلد کا صحیح تعین کیا۔ عمر خیام نے ایک تقویم تیار کی جو جارجوی تقویم سے

زیادہ صحیح ہے' کیونکہ جارجوی تقویم میں تین ہزار تین سو سال میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے اور عمر خیام کی تقویم میں پانچ ہزار سال میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔ عمر خیام نے علم ہیئت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ بارہویں صدی عیسوی میں الادریسی نے صیقلیہ کے بادشاہ راجرم دوم کے لئے چاندی کا ایک کرہ فلکی اور دنیا کا ایک کثورانما نقشہ تیار کیا۔

فلکیات اور علم ریاضی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور چونکہ زمانہ قدیم میں اہل ہند عربوں' اہل یونان اور اہل مصر کے مقابلہ میں بہتر ریاضی دان تھے۔ اس لئے فلکیات کا علم بھی وہی بہتر طریقہ سے جانتے تھے اور روایت ہے کہ جو ہندوستانی عالم علم ہیئت کی کتاب سدھانت خلیفہ المنصور کے دربار میں لایا تھا' وہی اپنے ساتھ علم ریاضی کی ایک کتاب بھی لایا تھا جس کی وجہ سے عربوں میں علم ریاضی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کتاب کو بھی الفزاری نے عربی میں منتقل کیا اور اسی کی بدولت عرب صفر اور دوسرے ہندی اعداد سے متعارف ہوئے۔ انہوں نے ہی اعداد کو ہندی اعداد کے نام سے موسوم کیا لیکن جب یہ اعداد عربوں کی وساطت سے یورپ پہنچے تو انہیں عربی اعداد یا اعداد خوارزمی کا نام دیا گیا' کیونکہ خوارزمی ہی پہلا مسلمان تھا جس نے یہ اعداد استعمال کئے۔ علم الحساب اور الجبرا پر پہلی کتاب بھی الخوارزمی ہی نے لکھی اور اسی کی تصانیف پر مسلمانوں کے علم ریاضی کی عمارت کھڑی ہوئی۔ خوارزمی ہی علم الجبرا کا بانی مانا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے فلکیات اور ریاضیات کے علم کو آگے بڑھانے میں انسانیت کی بڑی خدمت کی۔ سال کا انضباط اور مدار شمس کی تحقیق' اعتدال ربیعی و خریفی کی حرکت کا تعین کر کے بروج و افلاک کے نقشوں کی تیاری انہی کے کارنامے ہیں۔ انہوں نے ہی آلہ سمت یعنی کواڈرینٹ (QUADRANT) ایجاد کیا جس سے ارتفاع سیارہ کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ اگر عرب علم الافلاک کی طرف توجہ نہ دیتے اور المجسطی کا ترجمہ نہ کرتے تو ہو سکتا ہے کہ یہ علم ہی ناپید ہو جاتا اور اگر مسلمان ہندی اعداد کو یورپ کی طرف منتقل نہ کرتے تو یورپ علم ریاضی میں کبھی وہ ترقی نہ کر سکتا جو اس نے بعد میں کی۔ مسلمانوں ہی نے علم تفاضل و تکامل (CALCULUS) اور مثلثات (TRIGNOMETRY) کے علم کو وضع کیا۔ الیکو یتھ نے ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت کے حالات میں لکھا ہے کہ طلیطلہ (TOLEDO) کے ایک ہیئت دان نے صرف اس غرض کے لئے چار سو رصد گاہیں قائم کیں کہ کرہ ارض کے لحاظ سے آفتاب کا بعید ترین نقطہ دریافت کیا جائے اور وہ اس میں اس قدر کامیاب ہوا کہ آج تک اس کی معلومات میں کوئی غلطی نہیں نکالی گئی۔ ابوالحسن علی جو یورپ میں Al-Hazen کے نام سے جانا جاتا ہے ارتفاع قطب معلوم کرنے کے لئے بحر متوسط (بحیرۂ روم) کی پیمائش کرنے پر تیار ہو گیا' ابن سینا نے ایک ہزار بائیس ستاروں کی فہرست تیار کی۔

ابن رشد نے عطارد کی حرکت معلوم کرنے کیلئے متعدد تجربے کئے۔ مسلمانوں کی ریاضی سے متعلق ایجادات میں رقاص ساعت (PENDULUM) بڑی اہمیت رکھتا ہے جس پر عصر حاضر کی گھڑیوں کی بنیاد رکھی گئی۔ انہوں نے ہوا یا کرہ ہوائی کی بلندی کا اندازہ بھی کیا اور مظاہر فطرت کی عملی تعبیر کر کے یورپ کے دل و دماغ سے اس خیال کو محو کیا کہ ان کا تعلق عالم ارواح سے ہے۔ ابوالحسن علی ہی نے سب سے پہلے نوامیس نور و مرئیات پر بحث کی اور اسباب منعکس کی وضاحت کی۔ اسی نے اس دور کے عام خیال کو غلط ثابت کیا کہ نور کی شعاعیں آنکھ سے پیدا ہو کر مرئیا کی طرف جاتی ہیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلے (ایثر) ETHER کے وجود کا پتہ لگایا۔ اس کی اکثر تصانیف سپین کے مدرسوں میں مدت تک پڑھائی جاتی رہیں۔ جنہیں یورپ والوں نے اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا۔ اسی طرح خوارزمی کی کتاب حساب الجبر و المقابلہ کا ترجمہ کریمونا کے جیرالڈ نے لاطینی زبان میں کیا جس کی وجہ سے یورپ میں الجبرا کے علم کا اسی نام سے رواج ہوا اور سولہویں صدی تک یہ کتاب یورپ کی یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ خوارزمی نے بطلیموسی اوتار کے بدلے جیب زاویہ کے استعمال کا طریقہ رائج کیا اور دو درجی مساوات کے حل کا ایک مشترک طریقہ بھی ایجاد کیا جسے الفرای نے مکعب مساواتوں کو حل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ عمر خیام نے جبر و مقابلہ کو اور ترقی دی اور ساتھ ہی علم مثلث کی مساواتوں کو حل کرنے کے طریقوں کو بہتر بنایا۔ آج علم مثلث میں نسبت و تناسب کے جو طریقے استعمال ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر البتانی نے معلوم کئے۔ علم مثلث اور علم مثلث کروی میں ابوالوفا' البغدادی' الخوجندی اور ابن یونس قابل ذکر شخصیات ہیں۔

احمد النہاوندی نے کسور کی تقسیم اور جزر المربع دریافت کرنے کے طریقے معلوم کئے۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں نے مختلف اعداد رائج کئے جو غوبر اعداد کہلاتے ہیں اور جو یورپی زبانوں میں لکھے جانے والے اعداد سے عربی اعداد کی نسبت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ ہسپانیہ ہی میں جابر نے گیارہویں صدی میں نو جلدوں پر مشتمل فلکیات پر ایک کتاب لکھی جس کے سامنے بطلیموس کی المجسطی بے وقعت ہو کر رہ گئی۔

ہسپانیہ کی اسلامی جامعات کی بدولت یورپ میں بھی آہستہ آہستہ علم کا چرچا ہونا شروع ہو گیا اور عربی کی علمی کتابوں کے ترجمے یورپی زبانوں میں ہونا شروع ہو گئے۔ اشبیلیہ کے جان اور باتھ کے ایڈی لارڈ نے ابو معشر اور خوارزمی کی زیچوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کئے اور الفانسو دہم نے البتانی کی زیچوں کو یورپی زبانوں میں منتقل کیا۔ کریمونا کے جیرالڈ نے جابر کی کتاب الہیت کا ترجمہ کیا' جو 1524ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ابوبکر' القیسی اور الفرغانی کی فلکیات کی کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کئے گئے۔ اس قسم کی تصانیف سے یورپ میں علم فلکیات کو فروغ حاصل ہونا شروع ہو گیا۔ یورپ مین جتنی بھی زیچیں شائع ہوئیں وہ

مسلمان فلکیوں کی زیچوں کا یا تو ترجمہ تھیں یا چربہ' کیونکہ اس وقت تک عربوں کی فلکیاتی زیچیں ہندوستانی اور یونانی پیش روؤں کی زیچوں پر سبقت لے گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس وقت چین میں بھی عربوں ہی کی تیار کردہ زیچیں استعمال ہو رہی تھیں۔ اگر یورپی زبانوں میں علم فلکیات کی اصطلاحات کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں بہت سے الفاظ عربی ہی سے لئے گئے ہیں مثلاً ALMANAC, NADIR, ZENITH MUKANTAR, اور AZIMUTH' عربی الفاظ سمت' نظیر' المناخ' المقنطر اور السموات ہی کی یورپی اشکال ہیں۔

برطانوی فضلاء ایڈی لارڈ' مورے اور راجر بیکن نے دورے علوم اور علم ریاضی کے ساتھ ساتھ طبیعات کا علم بھی ہسپانیہ کی اسلامی درسگاہوں سے حاصل کیا جسے بعد میں انہوں نے یورپ میں فروغ دیا اور انہی کی وجہ سے یورپ میں عربی اعداد نے رواج پایا۔ اب علم کے فروغ کے لئے یورپ میں بھی درسگاہوں کا قیام ہونے لگا۔ ان درسگاہوں کے اکثر استاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہسپانیہ کی اسلامی یونیورسٹیوں میں آتے اور اس علم کو یورپ میں پھیلاتے۔ اس زمانہ میں اشبیلیہ' غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں بڑی مشہور تھیں۔ یونیورسٹی کا تصور بھی یورپ والوں نے ہسپانیہ سے ہی لیا۔ راہب گربرٹ جب قرطبہ کی یونیورسٹی سے فارغ ہو کر نکلا تو فرانس اور اٹلی میں اس نے متعدد مدرسے قائم کئے۔ یہی شخص بعد میں سلوسٹر ثانی کے نام سے پاپائے روم کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس نے کلیسا میں فضلاء کو جمع کر کے عربی کتابوں کے ترجمہ کے کام کو جاری رکھا اور اس طرح چار سو سے زائد علمی کتابوں کا ترجمہ تیار کرایا۔ اس کے معاونین میں خاص لوگ ریمونڈ فرانسیس' ہرمان' میکال' اسکوتھ اور یوحنا اشبلی تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں پرٹوس گلفوس' روبر کروستھ اور راجر بیکن نے بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان میں سے اول الذکر ماہر کیمیا تھا جس نے اہل عرب سے بارود کی ترکیب حاصل کی اور راجر بیکن نے ابن الہیثم کے مسئلہ نور کو حاصل کر کے اس کی بنیاد پر عینک کی ساخت کی۔

یورپ ایک مدت دراز تک جہالت کی تاریکیوں میں پڑا رہا۔ گیلیلیو کو اپنے انکشافات پر اظہار ندامت کر کے معافی مانگنی پڑی' جبکہ چھ سو سال پہلے ابن یونس خلیفہ کے سامنے ریاضی اور فلکیات کے مسائل کی توضیح کر کے انعام پاتا رہا۔ اب یورپ میں آہستہ آہستہ آفتاب علم طلوع ہو رہا تھا' لیکن اس بڑھتی ہوئی روشنی علم و ہنر کے باوجود یورپی عوام کی وہی حالت تھی جو متعدد یونیورسٹیوں اور ہزاروں سکولوں اور کالجوں کی موجودگی کے باوجود اپنے ہاں نظر آتی ہے اور وہ اس لئے کہ غریب عوام بری طرح سے مذہبی پیشوائیت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور ہمارے آج کل کے ملاؤں کی طرح یورپ کے مسیحی پیشوا بھی ہر جدید علم کو

مذہب کے لئے خطرہ قرار دیکر اسے ٹھکرا دیتے تھے اور اگر علم اور دلائل و براہین کے حوالے سے کوئی بات کرتا تو اسے حوالہ دار درسن کر دیتے۔ مذاہب عالم میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جو حصول علم کے خلاف ہو۔ کیونکہ علم ہی تو وہ شمع ہے جو زندگی کی راہنمائی راہ مستقیم مطلب : دلیل اور برہان سے بات کرنے والوں کا پاؤں لکڑی کا بنا ہوتا ہے اور لکڑی کے پاؤں پر چونکہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا' اس لئے وہ غیر معتبر اور بے وقار ہے۔

خلفائے عباسیہ کے دور میں جب مختلف علوم و فنون نے رواج پایا تو المجطی میں بیان کردہ نظام افلاک کو بھی درست تسلیم کر لیا گیا۔ ہمارے علمائے تفسیر نے بھی اسے صحیح سمجھتے ہوئے متعلقہ قرآنی آیات کی تفسیر بھی اس نظام افلاک کے مطابق کر دی اور جب بطلیموسی نظام کو قرآنی آیات کی تائید حاصل ہو گئی تو محققین کی یہ کیسے جرأت ہو سکتی تھی کہ بطلیموسی نظام پر نقطہ چینی کریں۔ ممکن ہے کہ بعد میں آنے والے محققین میں سے کچھ ایسے بھی ہوں جو بطلیموسی نظام افلاک کو غلط سمجھتے ہوں لیکن وہ چونکہ معتزلہ کے انجام سے واقف تھے' اس لئے انہیں زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی ہو۔ وہ دور تو خیر ایسا تھا کہ علم الافلاک نے ترقی نہیں کی تھی' لیکن آج کل کے علم و حکمت سے پیدا ہونے والی روشن خیالی کے دور میں جبکہ دنیا میں ہر طرف علم و ہنر اور سائنسی علوم کا سیلاب آیا ہوا ہے اور زمین کا ہر خطہ علم کی روشنی سے بقعہ نور بن چکا ہے' اسلامی دنیا میں ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں افراد ایسے ہیں جو فلکیات کے متعلق جدید انکشافات کو تسلیم نہیں کرتے اور خلا نوردوں کی قمر پیمائی پر یقین رکھنے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ جب انسان نے پہلے پہل چاند پر قدم رکھا تو اخبارات میں دھوم مچ گئی۔ اس پر کوہاٹ کے ایک مولوی صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا کہ جو شخص ایسی خبروں پر یقین رکھتا ہے' اس کا اپنی بیوی سے نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ لاہور میں انہی دنوں شب برأت کی رات ایک مولوی صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ انہوں نے اخبارات میں خلا نوردوں کی شائع ہونے والی تصاویر بھی دیکھی تھیں جن کی حقیقت سے انکار کرنا ذرا مشکل نظر آرہا تھا' ان کی طرف کرتی ہے' لیکن مذہب کے ٹھیکیدار خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو ہمیشہ حصول علم کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ بنی نوع انسان کی راہنمائی کرنے والے یہ فتویٰ فروش ہمیشہ غریب عوام کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنی نشاط گاہیں سجاتے ہیں اور جب علم کی روشنی پھیلنے لگتی ہے تو یہ اس کی راہ میں دیواریں بنکر حائل ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے گھناؤنی مثال ہمیں ہندو مذہب میں ملتی ہے' جہاں ماضی میں ہر غیر برہمن پر حصول علم کی تمام راہیں مسدود کر دی جاتی تھیں۔ تقریباً ایسا ہی معاملہ ایک زمانہ میں اسلامی دنیا میں بھی پیش آیا جب صرف ایسے علوم کا حصول روا رکھا گیا جس سے مذہبی پیشوائیت کے مفاد پر زد نہیں پڑتی تھی۔ لیکن ایسے علوم کی

نشرواشاعت قطعاً" ممنوع قرار پائی' جس سے پیشوائیت کا وقار مجروح ہوتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید تو بار بار تدبر اور تفکر کی تاکید کرتا ہے اور مظاہر کائنات کے مشاہدے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن ہمارے علماء نے تفسیر بالرائے کرنے والوں کو ہمیشہ مطعون کیا ہے اور عقل و خرد کی بات کرنے والوں کو ہمیشہ ظلم و ستم اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔ ہماری تاریخ معتزلہ کے خون سے رنگین ہے' جنہیں طعنہ کے طور پر معقولیین کہا جاتا تھا یعنی یہ کہ وہ عقل کی بات کرتے تھے۔ اس کے بعد عقل و خرد سے کام لینے والوں کو ایسا بدنام کیا گیا کہ معقولی کا لفظ گالی بن کر رہ گیا۔ قرآن مجید ہمیشہ برہان و دلیل کی بات کرتا ہے اور مخالفین سے بھی کہتا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو کوئی دلیل و برہان پیش کرو۔ لیکن اسلام میں دلیل و برہان سے بات کرنا اس قدر معیوب قرار دیا گیا کہ مولانا جلال الدین رومی جن کی مثنوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ فارسی زبان میں قرآن ہی ہے' وہ بھی فرماتے ہیں:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

سامنے چودھویں کا چاند اٹھ رہا تھا' فرمانے لگے کہ اول تو یہ بات ماننے کے قابل ہی نہیں کہ کوئی انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے' لیکن فرض کیا کہ تم چاند پر پہنچ بھی گئے ہو تو آج تو چودھویں کا چاند ہے اور تمہیں چاند پر اترنے کی جگہ مل گئی ہے' اور اب جبکہ چاند گھٹنا شروع ہو جائے گا تو تم ایک طرف آہستہ آہستہ سرکتے جاؤ گے اور جب اس نے ہلال کی صورت اختیار کر لی تو تم اس کے ساتھ لٹک جاؤ گے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اماوس کے دن کہاں جاؤ گے۔ مولانا حضرات کا یہی مبلغ علم ہے اور اس پر ہر محراب و منبر سے قوم کی رہبری کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

مولانا حالی نے ایسے ہی علماء کے متعلق فرمایا تھا:

اب اس فلسفے پر ہیں جو مرنے والے شفا اور مجسطی کا دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے فلاطون کی اقتداء کرنے والے
یہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

جس طرح سکندر اعظم کی موت کے بعد یونانی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا خاتمہ ہو گیا بعینہ اسی طرح بغداد پر ہلاکو خان کے حملے کے بعد اسلامی تہذیب کا دور انحطاط شروع ہو گیا جسے کچھ مدت تک سلجوقیوں نے سنبھالے رکھا اور ایشیائے کوچک میں عثمانیوں کی سلطنت کی بنیاد پڑنے پر مسلمان سنبھل گئے۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت اور اس کے ساتھ اسلامی تہذیب و ثقافت موت سے

ہمکنار ہونے لگی۔ لیکن مشرقی یورپ میں عثمانیوں کی پیش قدمی نے اس کا کچھ ازالہ کر دیا۔ مگر حالات بتا رہے تھے کہ یورپ میں علم و حکمت کا باب کھل چکا ہے اور تہذیب و تمدن، علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کا ہما اپنا آشیانہ بدلنے کے لئے پر تول رہا ہے۔

نرخنامہ اشتہارات

ٹائٹل کے صفحات	ایک بار کیلئے	سال بھر کیلئے
پشت پر	800 روپے	6000 روپے
(اندرونی صفحات)	600 روپے	5000 روپے
اندرونی صفحات		
پورا صفحہ	500 روپے	4000 روپے
نصف صفحہ	300 روپے	2000 روپے
چوتھائی صفحہ	150 روپے	

مذکورہ بالا شرح ایک رنگ کے اشتہار کے لئے ہے۔ اشتہار شائستہ اور معیاری ہونے چاہئیں۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ایم بشیر احمد

وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (47/11)

قرآن کریم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس روئے زمین پر انسانوں کے دو گروہ ہیں۔

(i) مومنین کا گروہ (ii) کافرین کا گروہ

مومنین کا گروہ وہ ہے جو اللہ۔ اس کے انبیاء و رسل علیہم السلام۔ اس کی کتابوں۔ اس کے ملائکہ اور یوم آخرت پر پکا ایمان و اعتقاد رکھتا ہے۔ یوم آخرت پر ایمان انسان کے کردار کی تعمیر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صرف ایمان بالآخرہ ہی ہے جو انسان کے اندر یہ احساس بیدار رکھتا ہے کہ اس نے دنیا کی اس عارضی زندگی کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور اللہ کے حضور حاضر ہو کر اپنے تمام اعمال و افعال کی جوابدہی کرنا ہے اور اس دائمی زندگی کی خوش حالی یا بدحالی کا دارومدار انسان کے ان ہی اعمال پر ہو گا جو وہ اس دنیا کی عارضی زندگی میں انجام دے گا۔

مومنین کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اللہ نے نہایت اعلیٰ انتظام کر رکھا ہے۔ فی زمانہ چونکہ انبیاء و رسل علیہم السلام کا آنا بند ہو چکا ہے۔ وحی و کتب سماوی کا نزول ختم ہو گیا ہے اس لئے اللہ رب العالمین نے اپنے آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ آخری کتاب قرآن کریم کو قیامت تک محفوظ و مصئون کر دیا ہے۔ دنیا میں ہزار انقلاب آئیں۔ یہ کتاب محکم اپنی اصلی اور مصفّٰی صورت میں ہمیشہ موجود رہے گی۔ اس کا نور ہر زمانہ میں ضَوفشاں رہے گا اور ہدایت کے تمام متلاشیوں کو حسبِ ضرورت اللہ کے راستے کی طرف رہنمائی ہوتی رہے گی۔ اللہ نے کرم نوازی سے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ وہ اپنے مومنین کا مولیٰ ہے' ان کا محافظ ہے۔ ان کا ولی اور دوست ہے۔ ان کا رہنما ہے۔ ان کی تمام ضروریات کا کفیل ہے۔ ان کے حال اور مستقبل کا نگہبان ہے۔ جس کا اللہ خود مولیٰ ہو اس کو کیا فکر اور پریشانی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مومنین کو کوئی پریشانی لاحق ہی نہیں ہو سکتی--- یہ نہیں کہ ان کو کبھی کوئی تکلیف اور دکھ نہ پہنچے گا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہے گا۔ لیکن مومنین کی قلبی کیفیت ایسی ہو گی کہ وہ ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔ صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ہر وقت نہایت خشوع

و فقرع اور سرشاری سے دل و دماغ اور قول و فعل سے یہ اعلان و اظہار کرتے رہیں گے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ (2/156)

ہم تو ہیں ہی اللہ کا مال اور ہم نے آخر الامر لوٹ کر اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔ اگر ہم کو اس دنیا کی چند روزہ زندگی میں کچھ مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑ بھی جائے تو کیا پرواہ ہے۔ اللہ ہمارا مولیٰ ہے۔ وہی ہمارا سرپرست ہے۔ وہ ہم کو کبھی تنہا اور بے یارو مددگار نہ چھوڑے گا۔ کتنا بڑا اطمینان ہے جو مومنین کو حاصل ہوتا ہے۔ خود اللہ رب کریم کا ارشاد ہے کہ **اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ** (13/28)

مومنو! یہ حقیقت ہمہ وقت پیشِ نظر رہے کہ دلوں کا اطمینان صرف اور صرف اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اور اللہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ اللہ کی آخری دائمی لازوال کتاب قرآنِ کریم ہے جو مومنین کے لئے ضابطہء حیات ہے۔

پس اس ضابطہء حیات کے مطابق عمل کرتے جاؤ اور اطمینانِ قلب کی دولت سمیٹتے جاؤ۔

چنانچہ نہایت وضاحت سے اللہ رب العزت نے فرما دیا کہ۔

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَ اشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ ○ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ط وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ○ (سورہ البقرہ (2) آیات 152 تا 157)

(152) (مومنو!) تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا (تم میرے نازل کردہ ذکر قرآن کریم کے مطابق عمل پیرا رہو۔ میں مسلسل تمہاری حفاظت و نگہبانی کرتا رہوں گا۔ (اس ذکر کا عملی طریقہ یہ ہے کہ) تم میرا شکر ادا کرتے رہو (میری ہر نعمت کا نہایت مناسب اور صحیح استعمال کرتے رہو اور کسی نعمت کا غلط استعمال کر کے) میری ناشکری کبھی نہ کرو (کیوں کہ یہ کفر ہے)۔

(153) لہٰذا اے ایمان کے دعوے دارو! استعانت صرف مجھ ہی سے طلب کرو (ہر آزمائش میں صبر و استقلال اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اور اپنے تمام فرائض منصبی بمع صلواۃِ مؤقت نہایت صدق و صفا سے پورے کرتے رہو) اور یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ

اللہ کی معیت یقیناً یقیناً صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے (جس قدر زیادہ صبر و

ثابت (دکھاؤ گے اسی قدر زیادہ اللہ کا تعاون حاصل ہوتا جائے گا)

(154) (اللہ کی راہ میں موت کو گلے لگا لینا تو مومنین کا شعار ہے۔ جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے وہ تو دین و دنیا میں سرفراز و سُرخرُو ہو جاتا ہے۔ وہ بامراد اور فائزالمرام ہو جاتا ہے۔ اس کے درجاتِ رفیعہ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ارے وہ تو کبھی مرتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو موت کو بھی مار دیتا ہے لہٰذا:

جو لوگ اللہ کی راہ میں (دین اللہ کی سرفرازی اور بلندی کی خاطر) قتل ہو جائیں۔ ان کو مردہ مت کہو۔ وہ تو زندہ (جاوید) ہیں البتہ تم کو (ان کی اس حیاتِ جاوداں کا) شعور نہیں ہے۔

پس اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے قطعاً" نہ ڈرو۔ تمہاری تو کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس راہ کے سب سے پہلے مقتول تم ہو۔

(155) تو ہم تم کو کسی نہ کسی ابتلا میں ڈالتے رہیں گے مثلاً

(i) کبھی کوئی (عارضی) خوف تم پر طاری ہو جائے گا۔

(ii) کبھی بھوک کا عذاب مسلط ہو جائے گا۔

(iii) کبھی اموال میں نقصان ہو جائے گا۔

(iv) کبھی جانوں تک کا اتلاف ہو جائے گا۔

(v) کبھی (محنتوں کے) ثمرات سے تم محروم رہ جاؤ گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(تو ان حالات میں گھبرانے اور پریشان ہونے اور جذع و فزع کرنے کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔ یہ عارضی اور وقتی ابتلاء ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم صبر و استقلال اور عزم و ہمت سے تمام آزمائشوں کا مقابلہ کرو اور اپنے حسنِ تدبیر سے ان کا خاتمہ اور قلع قمع کرو اور ان کا نعم البدل تلاش کرو۔ (اسی لئے ہم نے تو اپنے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دے دیا ہے کہ) آپؐ صبر (واستقلال اور عزم و ہمت) کا مظاہرہ کرنے والوں کو بشارتیں ہی بشارتیں سنا دیں (کہ ان کی یہ ساری مصیبتیں محض عارضی ہیں۔ یہ جلد دور ہو جائیں گی)۔

(156) (البتہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ تم لوگوں کو خوب طرح سے معلوم ہو جائے کہ یہ صابرین (صبر و ہمت کا مظاہرہ کرنے والے) کون لوگ ہوتے ہیں)۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت ٹوٹتی ہے تو وہ (گھبرانے، پریشان ہونے، رونے دھونے یا واویلا کرنے کی بجائے نہایت سکونِ قلب سے) یہ اعلان کرتے رہیں کہ ہم تو ہیں ہی اللہ کا مال اور ہم نے

آخر کار اسی کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے (یہ مصیبتیں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہماری زندگی ختم کر سکتی ہیں۔ تو یہ زندگی تو ہے ہی ختم ہونے کے لئے۔ اصل زندگی تو موت کے بعد ملے گی اور جتنی جلد یہ زندگی حاصل کر لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ لہٰذا ہم ان مصیبتوں کو پرِ کاہ کی بھی وقعت نہیں دیتے اور ہم ہر وقت موت کو گلے لگانے کو تیار ہیں تاکہ جلد از جلد اپنے اللہ کے ہاں پہنچ جائیں اور حیاتِ جاوداں حاصل کر لیں)۔

ہم نے دیکھا کہ مومنین کا مولیٰ اللہ ہے۔ وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ ہر وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کی ہر طرح سے مدد و معاونت فرماتا ہے۔

اس کے برعکس کافرین کا کوئی مولیٰ نہیں ہوتا۔

اس دنیا کی چند روزہ زندگی میں ہو سکتا ہے کہ وہ نہایت مرفع الحال ہوں' حشام و خدام' مال و دولت' عزت و اقتدار ان کو حاصل ہو۔۔۔ مگر تا بہ کے۔ دیر یا سویر ان لوگوں کو مرنا ہے۔ موت کے بعد یہ سب عارضی سامانِ عیش و راحت ان سے چھوٹ جائیں گے۔ وہ یکہ و تنہا اپنے رب کے حضور جا حاضر ہوں گے' وہ ان کو کفر و شرک اور غرور و تکبر کی وجہ سے دائمی عذاب میں گرفتار کر دے گا۔ یہاں پر ان کو موت بھی نہ آئے گی کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ جائیں۔ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان پر سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا۔ مسلسل اور روز افزوں عذاب میں ابدالآباد کے لئے جلتے اور تڑپتے رہیں گے۔

بڑی آرزو کریں گے کہ ان کو کوئی مولیٰ' کوئی حامی و ناصر' کوئی دوست و مددگار مل جائے۔ مگر ان کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو گی۔

ہم نے اس مضمون کا عنوان رکھا تھا۔

اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (47/11)

اس حوالے سے ہم سورۃ محمد (47) کی چند ابتدائی آیات بینات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہماری آنکھیں کھل جائیں۔ اور روز روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ واقعی کافرین کا کوئی مولیٰ نہیں ہو گا۔

ارشاد ہے:-

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ○ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰى

اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۙ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ○ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ○ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ○ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ○ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ○ (سورۃ محمد (47) آیات 1 تا 12)

(1) جو لوگ (اللہ سے) کفر و انکار اور ناشکری کا وطیرہ اختیار کرتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کے راستے (صراط مستقیم) سے روکتے ہیں۔ اللہ ان کے اعمال برباد کر دیتا ہے۔

(2) (ان کے برعکس) جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور صلاح و فلاح کے کام کرتے ہیں اور خصوصا اس (قرآنِ کریم) پر ایمان لے آتے ہیں جو جناب محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا ہے اور یہ (ساری حقیقتِ نزولِ قرآن اور خود قرآنِ کریم) ان کے ربّ کی طرف سے بالکل حق (اور سچ) ہے تو ایسے لوگوں سے ان کی حیات (لغزشیں کوتاہیاں وغیرہ) محو کر دی جاتی ہیں اور ان کی حالت سنوار دی جاتی ہے۔

(3) یہ تمام کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ

(i) جو کافرین ہیں وہ تو (اللہ، محمد صلی اللہ وسلم اور قرآنِ کریم کو چھوڑ کر) الباطل کا اتباع کرتے ہیں۔

(ii) اور جو مومنین ہیں وہ اپنے رب کی طرف سے (نازل کردہ) الحق (قرآنِ کریم) کا اتباع کرتے ہیں۔

تو یوں اللہ لوگوں کے لئے ان کے امثال (حالات و کوائف) یہاں فرما دیتا ہے (کہ شاید عبرت حاصل کر لیں)۔

(4) (تو اے مومنو!) جب بھی تمہارا کفار سے (میدانِ جنگ میں) آمنا سامنا ہو جائے تو اس وقت (ان کی) گردنیں اُڑانا (اصلاً" کام) ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خون ریزی کر لو۔ تو پھر (باقی ماندہ زندہ بچ جانے والوں کو) قید کر کے خوب مضبوطی سے باندھ دو اور پھر جب جنگ جُو اپنے ہتھیار ڈال دیں (کافر مخالفین جنگ کو بند کرنے پر مجبور ہو جائیں) تو اس کے بعد ان قیدیوں کو یا تو۔

(i) احساناً" آزاد کر دینا چاہئے۔

(ii) یا (حالات کے مطابق) فدیہ لے کر چھوڑنا چاہئے۔ یہ کام یوں ہی کرنا ہو گا۔

اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ خود ان کافروں سے (کسی اور طرح سے) بدلہ اور انتقام لے لیتا۔ لیکن (اس کی مشیت تو یہ ہی ہے کہ) وہ تم لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہی ابتلاء و آزمائش میں ڈالے (اور تم اپنے زورِ بازو اور قوتِ دل و دماغ سے اپنے دشمنوں کو زیر کرو۔

(بہرکیف اس سلسلے میں یاد رکھنے اور پلے باندھنے کی بات یہ ہے کہ)

جو لوگ اللہ کی راہ میں (جہاد و قتال کرتے ہوئے) قتل ہو جائیں تو ان کے اعمال کبھی ضائع اور برباد نہ ہوں گے۔

(5) اللہ فوراً ان کی ہدایت کے سامان پیدا کر دے گا اور ان کی حالت (کی اصلاح کر کے) سنوار دے گا۔

(6) اور ان کو اس جنّت میں داخل فرما دے گا جس کا اس نے ان کے لئے (اچھی طرح سے) تعارف کرا رکھا ہے۔

(7) تو اے ایمان والو! (ہمارا یہ دائمی اور ابدی اصول یاد رکھو کہ) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے (اس کے احکامات و ہدایات کے مطابق اس کی راہ میں جہاد و قتال کرو گے) تو اللہ تمہاری مدد و نصرت کرے گا۔ اور تمہارے قدموں میں ثبات (اور استقلال) پیدا فرما دے گا۔ (تم کو ثابت قدم رکھے گا)

(8) اس کے برعکس جو لوگ کفر و انکار اور ناشکری کا اظہار کریں گے وہ منہ کے بل ایسے گریں گے کہ ہلاک ہو جائیں گے۔ اور ان کے اعمال ضائع اور برباد ہو جائیں گے۔

(9) یہ اس لئے ہو گا کہ اللہ نے جو کچھ نازل فرمایا (قرآنِ کریم) اس سے ان لوگوں نے کراہت کی اور اس کو ناپسند کیا۔ تو اللہ نے ان کے تمام اعمال اکارت کر دیئے۔

(10) کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ وہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان سے قبل (اس قماش کے) جو لوگ تھے ان کا کیا انجام ہوا۔ اللہ نے ان کو تباہ و برباد کر دیا (ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی) اور ان کافروں کے لئے بھی اسی طرح کا (پہلے لوگوں کے عذاب کی مثل) عذاب ہو گا۔

(11) (یہ نیک و بد انجام آخر کیوں ہوتا ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ یقیناً مومنین کا مولیٰ (پشت پناہ، کارساز و حمایتی و معاون و مددگار) اللہ ہوتا ہے (جو ان کی خوش حالی کامیابی و کامرانی کا کفیل اور خرچہ دار ہوتا ہے) اور جہاں تک کافروں کا تعلق ہے ان کا تو قطعاً کوئی مولیٰ ہوتا ہی نہیں۔ (جو ان کی حمایت کر سکے)۔

(12) تو یوں جو لوگ ایمان لے آئیں اور صلاح و فلاح کے کام کریں (ان کا مولیٰ) اللہ ان کو ایسے باغات میں داخل فرما دیتا ہے کہ جن کے تحت (آبِ رواں کی) انہار جاری ہوتی ہیں (جو ان کی سیرابی و شادابی

کی ضامن ہوتی ہیں) اور جو لوگ کافرین ہوتے ہیں وہ محض اس دنیا کے مال و متاع سے تو متمتع ہو سکتے ہیں- اور (اس دنیا میں اپنے ابدی انجام سے بے خبر اپنے حال میں بدمست' محض پیٹ کے پجاری ہوتے ہیں)-

ایسے کھاتے (پیتے) ہیں جیسے کہ جانور (کھاتے پیتے ہیں)- نہ پاکی پلیدی کا خیال' نہ صفائی و ستھرائی کی طرف توجہ' نہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی پاسداری- بس کھائے جاتے ہیں اور کھائے جاتے ہیں- بالکل جانوروں اور مویشیوں کی طرح- لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ (آخرت کی زندگی میں) ان کا ٹھکانا جنہم ہی ہو گا-

اللہ ہم کو "مومنین" بننے کی توفیق دے تاکہ اللہ ہی ہمارا مولٰی و وارث ہو-

اللہ ہم کو کافرین کے زمرے سے بچنے اور محفوظ رہنے کی ہدایت دے تاکہ ہم بے یار و مددگار ہو کر جنہم کا ایندھن نہ بن جائیں-

---

گہر ہائے تابدار

● فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ ہر نبی کو بقدر ان لوگوں کے جو اس پر ایمان لائے، معجزات دیئے گئے۔ لیکن میرا معجزہ تو وحی (قرآن) ہے، جو خدا نے مجھ پر بھیجی ہے۔ (چونکہ یہ معجزہ دائمی اور تمام نوعِ انسانی کیلئے ہے) اس لئے مجھے امید ہے کہ سب انبیاء سے زیادہ قیامت کے روز میری امت ہوگی۔ (بخاری جلد سوم۔ باب فضائل القرآن)

● فرمایا کہ مجھ سے (قرآن کے علاوہ) کوئی بات نہ لکھو، اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھ لیا ہو، وہ اسے مٹا ڈالے (مسلم)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

منظور احمد (ناروے)

کلچر

اس دنیا میں ہر انسان اپنا تشخص قائم رکھنے کی فکر میں ہے۔ کوئی اپنی ذات کو رنگ و نسل کے حوالے سے منوانا چاہتا ہے تو کوئی وطن اور زبان کے حوالے سے۔ سیکولر معاشروں میں پہچان کا ذریعہ ان کا کلچر قرار دیا جاتا ہے۔ یورپ میں آج کل اس لفظ کا کچھ زیادہ ہی چرچا ہے۔ جسے دیکھو کلچر کی مالا جپ رہا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ کلچر کی تسبیح پھیر رہا ہے۔ ہر چند کہ یہ تہذیبوں اور معاشروں کے سمٹنے کا دور ہے اور نظر آتا ہے کہ عنقریب ایک نئی تہذیب جنم لینے کو ہے' جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس سمت بڑھتی ہے اور کونسا رخ اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا مجھے اپنے موضوع کی طرف بڑھنا چاہئے۔

'کلچر' ایک جامع اصطلاح ہے جو مجموعہ ہے تہذیب' ثقافت اور تمدن کا۔ تہذیب بنا ہے زیب سے' جس کا مطلب ہے راستہ' طریقہ یا مسلک۔ مذہب اور مہذب بھی زیب ہی سے مشتق ہیں۔ تمدن' مدن سے بنا ہے۔ مدن' مدینہ کی جمع ہے جس سے مراد شہریت یا مدنیت ہے۔ ثقافت' عقل و ہوشمندی کا نام ہے۔ اس طرح تہذیب' تمدن اور ثقافت یا کلچر کا مطلب ہوا طرز بودو باش۔ اس میں شرافت (Decency) کو بطور غیر متبدل قدر کے شامل کر لیا جائے تو یہ طرز زندگی' اس کی شکل خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو' انسانیت کے لئے لائق تبریک و تحسین بن جائیگی۔

یورپ میں لفظ کلچر آج تک شرمندہ معنی نہیں ہو سکا۔ مذہب کی طرح اس لفظ کی بھی کوئی ایسی تشریح (Definition) موجود نہیں جس پر سب دانشوران مغرب متفق ہوں۔ ان کے ہاں ایک بات البتہ مشترک ہے اور وہ یہ کہ کلچر نہ مستقل ہے نہ غیر متبدل۔ یہ ہمیشہ سے بدلتا آیا اور بدلتا رہیگا۔ ان کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ منجملہ دوسرے عناصر کے طرز بودو باش کا زیادہ تر انحصار مذہبی تصورات پر ہوتا ہے یا جغرافیائی حالات اور ضروریات زندگی کے حصول پر۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں پانی کی قلت کے پیش نظر وہ لوگ پانی کے لئے ایسا برتن استعمال کرنے پر مجبور ہیں جس سے پانی' کم سے کم ضائع ہو۔ جیسے "لوٹا"۔ ہر چند کہ یہ اصطلاح اب پاکستانی سیاست میں بھی در آئی ہے' لیکن ہماری مراد اس سے پانی کا برتن ہی ہے۔ اس کے مقابلے میں بھارت جیسے گرم مرطوب علاقوں میں جہاں پانی کی فراوانی ہے' لوگ ایسے برتن کو ترجیح دیتے ہیں' جس سے پانی آسانی سے انڈیلا جا سکے۔ جیسے "گڑوی"۔ اب اگر دیکھا جائے تو لوٹے اور گڑوی کا استعمال ان

خطوں کی جغرافیائی ضرورت ہے جسے خواہ مخواہ مذہب سے وابستہ کر لیا گیا ہے۔ یہی حال لباس کا ہے۔ لباس کا تعلق موسمی حالات سے ہے۔ جیسا موسم' ویسا لباس۔ گرم مرطوب علاقوں میں رہنے والے مسلمان لاکھ چاہیں' عربوں جیسا غلاف آدم کبھی نہیں پہن سکتے۔ نہ ہی لندن کے مسلمان شلوار قمیض میں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ بندھی ہوئی انسان کی جمالیاتی حس ہے' جو ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ لباس جو زینت کا امین اور ستر پوشی کی علامت تھا' شان تنوع کے پردے میں' تغیر شب و روز کی طرح اتار چڑھاؤ کا شکار ہے۔ آج انتہائی مختصر ہے تو کل اتنا دراز کہ زمین کو چھونے لگے۔ لباس ہی کے ضمن میں' ہمارے ہاں کل تک ننگے سر گھومنا قابل سرزنش جرم تھا۔ آج نماز تک میں لوگ ننگے سر دکھائی دیتے ہیں۔ کل تک مونچھ مردانگی کی علامت اور چوٹی نسوانیت کا زیور خیال کی جاتی تھی۔ آج ہر دو غائب ہیں۔ تعلیم نسواں کل تک ہمارے ہاں شجر ممنوعہ تھی آج کسی کو جرات نہیں کہ اس کے خلاف ایک لفظ کہہ سکے۔ ہماری دھیمے سروں کی موسیقی جسے کل تک روح کی غذا کہا جاتا تھا' آج شور کے ساتھ زور کی بھی مظہر ہے۔ رستم زماں' اکرم' بھولو اور جھارا سوچتے ہونگے کہ اکھاڑوں میں اترنے کی بجائے انہوں نے بھی آج کل کی مضطرب موسیقی پر طبع آزمائی کی ہوتی تو فن موسیقی میں پاکستان کا نام ہوتا۔ ادب کو لیجئے تو بے ادبوں کے دباؤ میں بیچارا ادب دب کر رہ گیا ہے۔ آج کا ادیب' بد نہادی خیال کا شکار ہے یا فساد تصور میں گرفتار۔ انشاء پردازی ویسے ہی دم توڑ چکی ہے۔ سٹیج ڈراموں کو دیکھئے تو مزاح اور تمسخر میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ دیار غیر کا رخ کریں تو آج سے 50/100 سال پہلے ناروے میں مقیم مقامی نارویجن جسے اپنا کلچر قرار دیتے تھے' آج اس کے چھینٹے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ آج یہ سب امریکہ کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ ایک بات البتہ ان کے ہاں منفرد ہے۔ وہ اپنی زبان میں ذرہ بھر ملاوٹ نہیں کرتے۔ کوئی غیر نارویجن لفظ زبردستی گھس آئے تو اسے اپنی زبان کا حصہ بنا لیتے ہیں لیکن اس ایک لفظ کی خاطر اپنی زبان نہیں بدلتے حالانکہ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے' مقصد نہیں۔ ذریعے کو مقصد بنا کر اس پر فخر کرنا احساس کمتری کی علامت تو ہو سکتا ہے وجہ تفاخر ہرگز نہیں۔ قائداعظم نے تحفظ دین کی خاطر' انگریزی بول کر انگریزوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا جب کہ اپنے آپ کو عرب (زبان دان) اور دوسروں کو عجمی (گونگے) کہنے والوں نے امریکنوں کو آج بھی دیں پناہ سمجھ رکھا ہے۔

اب تک کی بحث سے جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ نہ فنون لطیفہ کسی کی میراث ہیں' نہ لباس نہ زبان' نہ طرز بود باش کہ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے کسی قوم' ملک یا معاشرے کی پہچان قرار دیا جا سکے۔ اب لے دے کر ایک وطن رہ جاتا ہے جس پر کلچر کی بنیاد رکھی جائے۔

اس کی بھی سن لیجئے۔ یہاں ناروے میں پانچ سال گذارنے کے بعد ہر غیر ملکی کو ناروے کی شہریت مل جاتی ہے' جس سے پاکستانیوں کو وحشت ہوتی ہے کہ ان کی Nationality بدل گئی ہے۔ حالانکہ یہ اضطراب

قرآن اور اس پر مبنی دو قومی نظریے سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہے۔ قرآن کریم کی رو سے قوم' نظریے کی بنیاد یا ایمان کے اشتراک پر استوار ہوتی ہے نہ کہ اوطان کی بنیاد پر' پاسپورٹ بدلنے سے صرف شہریت بدلتی ہے نہ کہ قومیت۔ دوسرے الفاظ میں نارویجن' برٹش یا ترک پاسپورٹ حاصل کر لینے پر ہم نارویجن۔ برٹش یا ترک مسلمان کہلائیں گے۔ رہیں گے مسلمان ہی کہ مسلمان ہماری قومیت ہے اور ناروے۔ برطانیہ یا ترکی ہماری شہریت۔ پاکستان میں رہنا پاکستان والوں کی شہریت ہے قومیت ہرگز نہیں۔ حکومت پاکستان اگر دو قومی نظریے سے انحراف نہیں کر گئی تو اسے چاہئے کہ پاسپورٹوں میں Nationality کے کالم میں 'مسلم' اور Citizenship کے کالم کا اضافہ کر کے اس کے سامنے 'پاکستانی' لکھنے کو رواج دے۔

آج ذرائع مواصلات کی ترقی سے بظاہر وسیع و عریض دنیا ایک گلوبل ولیج (Global Village) کا روپ دھار چکی ہے۔ انداز زیست ہر آن بدل رہا ہے' ایک دوسرے کی معاشی' معاشرتی' اقتصادی اور ثقافتی قدریں آپس میں بغلگیر ہو رہی ہیں۔ مشرق آرکسٹرا کی طرف بڑھ رہا ہے تو "گھڑا"۔ "بانسری" اور "وائلن" مغرب میں بھی سنائی دینے لگی ہے۔ پاکستانی راک اینڈ رول کے چنگل میں ہیں تو تگنی کا ناچ یورپین بھی ناچ رہے ہیں۔ انفرادیت نہ زبان میں رہی' نہ لباس میں' نہ فن تعمیر میں' نہ طرز بود و باش میں۔ وجہ تفاخر نہ وطن رہا نہ رنگ نہ نسل۔ وہ کونسی جنس ہے جو ایک ملک میں ناپید ہے تو دوسرے میں موجود۔ کسی ایک کپڑے کا نام لیجئے وہ یورپ میں موجود ہے تو پاکستان میں بھی ویسے ہی دستیاب۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جسے کسی ملک یا قوم کا کلچر قرار دیا جائے یا جس پر کسی قوم' ملک یا افراد کے کسی طبقے کے تشخص کی بنیاد رکھی جائے۔ اب ظاہر ہے یہ کوئی ایسی چیز ہی ہو سکتی ہے' جس پر ہم ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت کے لئے تیار نہ ہوں۔ جس سے ہمارا ایک دوسرے میں نہ مدغم ہونا ممکن ہو نہ ایک دوسرے کے رنگ میں رنگے جانا۔ اور یہ ہے۔ ایمان۔ ایمان جس کی بنیاد پر ایک عیسائی پاکستان میں بھی عیسائی ہی رہتا ہے اور ایک مسلمان یورپ میں بھی مسلمان۔ ہندو جہاں بھی جائیگا زنار پوش ہی کہلائے گا اور یہودی ارض فلسطین میں بھی یہودی ہی رہے گا۔ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یاد رکھو! تمہاری شناخت کا ذریعہ نہ رنگ و نسل ہے نہ وطن' نہ زبان۔ تمہاری پہچان تمہارے نظریہ حیات سے ہے۔ تمہارا تعارف' تمہاری شناخت' تمہارا تشخص صرف اور صرف اس نظریہ حیات سے ہے جو تم نے از خود بطبیب خاطر اختیار کیا ہے۔ شناخت وہی زیب دیتی ہے جو خود اختیار کی جائے۔ ایک مسلمان کو یہ کبھی زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی شناخت' لباس کی تراش خراش سے کرواتا پھرے یا اپنی پہچان کے لئے فنون لطیفہ کے دریچوں میں جھانکتا پھرے۔

ایک سچا مسلمان ان تنگناؤں سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اس کی قہر آلود نگاہیں ہمیشہ اس غلط نظام پر لگی رہتی ہیں جس کے ظلم کی وجہ سے عدل و انصاف کے جنازے نکلتے ہیں۔ مسلمان کی شناخت صرف اور صرف وہ غیر متبدل قرآنی اقدار ہیں جن پر وہ سوچ سمجھ کر ایمان لایا ہے۔ وہ دنیا کے کسی برصغیر میں ہو یا بہر ذخائر

میں ہو' اس کی پہچان یہی اقدار ہیں۔ ہر چند کہ وہ نہ ذوق جمال سے عاری ہے نہ حس لطیف کا منکر۔ وہ فنون لطیفہ کا بھی ویسے ہی دلدادہ ہے لیکن جو چیز اس کے نزدیک اس کی شناخت کا ذریعہ اور اس کے لئے وجہ طمانیت قلب و ذہن ہے وہ مستقل اقدار ہیں جن پر وہ ایمان لایا ہے۔

افسوس صد افسوس کہ ہم اپنے کلچر کے تار پود طبلے اور سارنگی میں تلاش کر رہے ہیں یا اس لوک ورثے میں جسے تیاگ کر ہمارے بزرگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں ایک مسلمان ملک کے سربراہ کی آمد پر پاکستان کی وزیراعظم نے روشنیوں کے سیلاب میں پاکستانی مسلمانوں کے "کلچر" کا جو شرمناک مظاہرہ کیا اس پر قوم کا باشعور طبقہ تو سرگریباں تھا ہی' آسمان کے بادل بھی دھاڑیں مار مار کر روئے۔ یہ اگر معزز مہمان کی فرمائش تھی تب بھی ہماری محترم وزیراعظم کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے وہ الفاظ یاد ہونا چاہئیں تھے جو انہوں نے ان صحابہؓ سے کہے تھے' جنہوں نے حضورؐ کی نجی زندگی کے متعلق جاننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ "کیا آپ لوگ قرآن نہیں پڑھتے؟"۔ لیکن نہیں جب کوئی قوم پٹڑی سے اتر جاتی ہے تو بحکم الٰہی اسے بندر بنا دیا جاتا ہے کہ دوسروں کی نقالی اس کا شعار بن جاتا ہے۔ اور وہ اس فن میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ یہاں یورپ میں ایک مذہبی فرقے نے' جواب آں غزل کے طور پر' اپنا نام ہی اسلامک کلچر سنٹر رکھ چھوڑا ہے۔ یورپ ہی کیا' سنا ہے پاکستان میں قوم اپنے کلچر کے نشانات ڈھونڈنے کے لئے کروڑوں روپے سالانہ کھدائی پر خرچ کر رہی ہے اور نہیں جانتی کہ اس کا کلچر اپنی تمام ثقافتی اکائیوں Cultural Shades کے ساتھ اللہ کی کتاب عظیم میں لکھا ہوا موجود ہے۔ یورپ والے اپنی شناخت اپنے کلچر میں ڈھونڈ رہے ہیں' تو یہ ان کی مجبوری ہے کہ کوئی دوسری وجہ شناخت انہیں نظر نہیں آتی مگر حیرت ہے کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟۔ سچ کہا تھا فگار نے

انسان ہے گرفتار ابھی جہل خرد میں
اللہ سے پہچان کا مطلب نہیں سمجھا
ہر لمحہ ستاتی ہے جسے خواہش دنیا
وہ ذات کے عرفان کا مطلب نہیں سمجھا
روتا ہوں فگار آج کے انساں کی خرد پر
اللہ کے فرمان کا مطلب نہیں سمجھا

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

1- اسلامی پردہ اور عریاں چہرے

اسلامی پردہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ہفت روزہ جریدے تنظیم اہلحدیث کے 16 جون 95 کے شمارہ میں مدیر صاحب بین السطور رقمطراز ہیں :-

"چنانچہ پرویزی حلقہ کی طرف سے بھی "قربانی" کے مسئلہ پر اس قسم کا جائزہ پیش کیا گیا ہے"

طلوع اسلام :- اہلحدیث حضرات اپنی مستورات کو لباس پہنائیں یا غلاف اوڑھائیں، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم اپنے ان فاضل بھائیوں سے اتنا ضرور عرض کریں گے کہ حدیث کے ساتھ اگر قرآن پر بھی ان کا ایمان ہے تو قرآن کی سورۃ نسا کی آیت 112 ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ آیت اور اس کا ترجمہ یوں ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (4/112)

جو شخص کوئی قصور یا گناہ تو خود کرے لیکن اس سے کسی بے گناہ کو متہم کر دے تو اس نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر رکھا۔ (ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری)

اہلحدیث حضرات اپنے آپ کو اہلحدیث لکھنا یا کہلانا پسند فرماتے ہیں تو انہیں مبارک۔ ہمارا نام اللہ تعالیٰ نے مسلمان رکھا ہے۔ (22/78)۔ لہٰذا ہم ممنون ہونگے اگر آئندہ ہمیں اسی نام سے پکارا جائے۔

2- سنّت

ماہنامہ صدائے ہوش کو اعتراض ہے کہ نویں جماعت کی انگریزی کی کتاب میں حضور نبی اکرمؐ کے آخری خطبہ میں سے درج ذیل عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

"O PEOPLE I AM LEAVING TO YOU THAT WHICH WILL KEEP ON THE RIGHT PATH SO LONG AS YOU ACT UPON IT THIS IS BOOK OF GOD AND SUNNAH OF HIS PROPHET"

صدائے ہوش بابت جون 1995ء

طلوع اسلام :- طلبا نے اساتذہ سے یہ پوچھ لیا کہ قرآن کے ساتھ سنت کی وہ کونسی کتاب تھی جو حضورؐ نے امت کے حوالے کی تھی تو وہ بیچارے کیا جواب دیں گے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مردِ خود آگاہ

(علامہ غلام احمد پرویزؒ -- یوم ولادت 9 جولائی 1903ء)

1- علّامہ پرویزؒ

علامہ پرویز مرحوم کا شمار' چوٹی کی ان نابغہ روزگار علمی شخصیات میں ہوتا ہے جو پچھلی دو صدیوں میں برِصغیر پاک و ہند میں پیدا ہوئیں- ان کا فلسفہ' فلسفۂ قرآن تھا- انہوں نے قرآنِ کریم کا اس گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا کہ اپنے اوائل عمر ہی سے قرآنِ کریم پر ان کی فراواں تحریریں مفصل' صاف و صریح' قابل فہم' غیر مبہم اور مؤثر انداز لئے ہوتی تھیں- انہوں نے جو کچھ سمجھا اور تحریر و پیش کیا' وہ بالعموم قرآنِ حکیم ہی کی تعلیمات پر مبنی ہوتا تھا- قرآنی موضوعات پر ان کی تقریریں ایسی دل نشیں اور مؤثر ہوا کرتی تھیں کہ فوراً سامعین کے دل و دماغ میں سرایت کر جاتی تھیں' یہاں تک کہ انہیں ایک دفعہ سننے والا' زندگی بھر کے لئے ان کے درسِ قرآن کا مستقل سامع بن جاتا' جس کا آغاز انہوں نے' دورانِ ملازمت ہی' کراچی سے کر دیا تھا- اپنی تمام تر توانائیوں کو' اپنے مشن (قرآن کریم کی منزہ اور خالص تعلیم کو بنی نوعِ انسان تک پہنچانے) کے حصول کے لئے' بھرپور انداز میں صرف کرنے کے لئے' انہوں نے اپنی ملازمت سے قبل از وقت (Pre-Mature) ریٹائرمنٹ حاصل کر لی اور 1956ء میں کراچی سے لاہور نقل مکانی کے بعد' یہاں پر انہوں نے سلسلۂ درسِ قرآن کریم کا از سرِ نو آغاز کیا- اس درسِ قرآن کا سلسلہ تا دمِ حیات (1984ء تک) جاری رکھا تا آنکہ وہ اکتوبر 1984ء میں بسترِ علالت پر فراش ہوئے اور طویل بیماری کے بعد 24 فروری 1985ء کو وہ اپنی حیات کے مرحلۂ اخروی میں داخل ہو گئے-

علامہ پرویزؒ ایک راسخ الاعتقاد انسان تھے' لہٰذا انہوں نے جو کچھ سمجھا' کہا اور پیش کیا اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہے (گو انہوں نے اپنی فہم قرآن کو کبھی بھی حرف آخر نہیں سمجھا)- ان کی زندگی میں ہی' ان کے افکار و خیالات کے خلاف ایک طویل سلسلۂ مخالفت جاری رہا لیکن چونکہ وہ صراطِ مستقیم پر جادہ پیما تھے' وہ ایک چٹان کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے-

(ڈاکٹر سید عبدالودود)

2- علّامہ پرویزؒ کا مسلک و مشرب

قرآن کریم "قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نوع انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے- یہ ایسے ابدی حقائق پر مشتمل ہے' جن پر زمانہ کے تغیرات اثر انداز نہیں ہو سکتے اور جو اس قدر عالمتاب اور ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے اور تاریخ کے ہر دور میں انسانی فکر کی امامت کرتے ہیں"-

"میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں- میری زندگی' بچپن سے لے کر اس وقت تک' اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے- ابتداً میں نے بھی (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) اس کا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا' لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی- بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ:

منزل و مقصودِ قرآن دیگر است ۔ رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اس وقت جب میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا' علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی سے (من جملہ دیگر امور) یہ اہم نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رُو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے"۔ (علامہ غلام احمد پرویزؒ)

دین میں سند اور حجت

"میرے نزدیک دین میں سند اور حجت' خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ جو کچھ اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے میں اسے قرآنی معیار پر پرکھتا ہوں۔ جسے اپنی بصیرت کے مطابق' قرآن کے مطابق پاتا ہوں' اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔ جو اس کے خلاف نظر آئے اسے غلط سمجھتا ہوں۔ مجھے کسی کی دلآزاری مقصود نہیں' لیکن اگر کوئی اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے کسی ایسے عقیدہ یا نظریہ کو' جسے میں قرآن کے خلاف پاتا ہوں' غلط کیوں ٹھہرایا جاتا ہے' تو اس کے لئے میں معذور ہوں --- قرآن کی رو سے کتمانِ حقیقت جرمِ عظیم ہے اور منافقت' انتہائی دنائت"۔ (علامہ غلام احمد پرویزؒ)

شرف و عظمت کا راز

قرنِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا (43/43)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؐ خدا سے کریں گے (25/30)۔ اس لئے کہ الدین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اسے چھوڑ دینے سے الدین چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی الدین سے تمسک ہو سکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ الدین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ دین' قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں' وہ دین نہیں۔ اور قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (15/9)۔ (علامہ غلام احمد پرویزؒ)

توشۂ آخرت

ایڈیٹر چٹان کو آج تک جناب غلام احمد پرویزؒ سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا۔ کبھی ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی عظیم کتاب شاہکارِ رسالتؐ پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویزؒ بارگاہِ رسالتؐ میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے اور یہ کتاب ان کے لئے توشۂ آخرت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان فضلائے کے ساتھ انہیں جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔ (آغا شورش کاشمیری)

اظہارِ تشکر

جو کچھ میں پیش کرتا ہوں' اس میں کاہش و کوشش تو میری ہوتی ہے' لیکن اس کی ثمرباری اور نتیجہ خیزی توفیقِ ایزدی کی رہین منت ہوتی ہے۔

جب میں اپنی زندگی پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں' تو جن انقلابات سے میں گزرا ہوں' وہ خود مجھے بھی ناممکن الیقین سے نظر آتے ہیں۔ انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے جادۂ پُرپیچ و خم کو چھوڑ دینا تو چنداں دشوار نہ تھا' طلسم کدۂ تصوف کی بھول بھلیوں سے نکل آنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ یہ صرف فیضانِ قرآنی کی اعجاز نمائی ہے جس کے لئے میں بحضور رب العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہوں۔ (علامہ غلام احمد پرویزؒ)

BEAUTIFULLY BOUND VOLUMES
OF
THE MONTHLY TOLU-E-ISLAM MAGAZINE
FOR THE YEARS:
1966 TO 1992 (LESS 71 & 74)
ARE AVAILABLE FOR SALE AT THE FOLLOWING RATES:

FOR TOLU-E-ISLAM BAZMS Rs. 60.00 ONLY
FOR OTHERS Rs. 100 PER VOLUME
PACKING & POSTAGE EXTRA

LIMITED STOCK
PLEASE RUSH ORDERS
LEST YOU MISS

ضرورت رشتہ

لڑکی------ خوش شکل عمر 29 سال- تعلیم یافتہ برسر روز گار
صرف کویت میں رہائش پذیر گھرانے متوجہ ہوں-
رابطہ :- ابو نبیل پوسٹ بکس نمبر 1541 صفاۃ - کویت

صدمہ جانکاہ

بزم پنج کسی کے دیرینہ ساتھی صوفی مختار احمد اعوان صاحب کے والد گرامی محترم محمد عبداللہ اعوان صاحب' جو خود بھی تحریک طلوع اسلام کے شیدائیوں میں شامل تھے' 15 جون 1995ء کو وفات پا گئے- ادارہ طلوع اسلام اس صدمہ جانکاہ میں صوفی صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے- اللہ تعالیٰ قرآن کے اس شیدائی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے!

By submitting to "Allah's Laws" we come under the process of "cause and effect", the inexorable and unchangeable universal laws which Allah, the Creator, has self-imposed upon Himself. The movement in the universe and the development and integration of the human "self" depends upon them. A human has a unique position in this respect. He begins to function only when he himself takes the initiative and harmonises himself with the Laws of Allah. The results ensue in proportion to the effort he puts in. There is no Divine intervention, for there are no favourites and no bias in Divinity,. Intervention of any kind also implies violation of His own Laws and withholding of human free will. Such a behaviour could be a human failing, a human imperfection, but it does not behove Divinity. Seeing in this context, what Imran Khan achieved in the game of cricket was neither chance nor "Allah's Will", but "Allah's Laws" in all its ramifications, including emotional and psychological factors, a sheer matter of cause and effect.

Now, regarding "dual functions of a Muslim", Imran Khan says, "One towards God and the other towards fellow human beings". (If this is not Secularism, what is !) He has drawn this conclusion from the statement "Those who believe and do good deeds". I do not see any connections between this statement and dualism. The Quranic position is absolute "Unity of Law"' (monotheism). Duality of law would mean chaos in the universe. Hence, obedience to Allah's Laws is in fact service to humanity. Allah does not need our services. It is we, the humans, who need His laws. If "*Namaz*", "*Roza*", "*Haj*" and "*Zakat*" are considered as such they are institutions in the service of the human race designed by Allah. "*Namaz*" gives humans dignity, pride and freedom, when he can walk on this earth without fearing another human being: "Roza" or rather "*Som*" gives him a base and a programme for a national army in place of a standing army; "*Zakat*" is the foundation of an economic system where every individual receives his basic needs as a birth-right; and "*Haj*" is a gathering which makes all this possible not just for Muslims, but the whole human race. So we see, that what is considered as functions towards God, are in reality functions towards humanity. Duality in life is fatal. Imran Khan himself, has decried the "imbalance between the body and soul" when criticising the West. "Dual functions", I am afraid, creates a similar imbalance. It is this split in our own lives in Pakistan that has made a mess of everything. To be a "*Namazi*" and "*Haji*" is one thing, to be a politician and a businessman is quite another, and we have chaos all around.

It so happens that both "Allah's Will" and "Dual functions" are traditional concepts inherited from a decadent past. It would be a good idea for Imran Khan to give more thought to these issues. These are the weak points in an otherwise readable article.

A FEED BACK

TO "ISLAM THE ONLY WAY" BY IMRAN KHAN

Miss Shamim Anwar

In the Tolu-e-Islam issue of the month of May, 1995, I came across an article "Islam the only Way" by Imran Khan. It is a good thing that he has appealed to the westernized group of Pakistan to study Islam, because my contention all along has also been that the educated class and the intellectuals have lost the battle by default by surrendering the Quran to the clergy who have their own axes to grind by monopolizing this area of research. This has serious repercussions on the Quranic revolution launched by Sir Syed Ahmed Khan, Iqbal and Jinnah. This revolution would also have solved the issue of the "*brown sahib*" which piques Imran Khan ever so much, for research has revealed that such complexes are the natural sequences to the imperialistic dominance and enslavement syndrome. But what is to he remembered in this human phenomenon is that it is the fall and decadence of a particular group that invites a conqueror. It is against this decadence that the Quran warns again and again "lest another people take their place who would not be like them." However ugly and cruel this situation may be ,as a student of history it has dawned upon me that had it not been for this "another people" the human specie would have been extinct by now. This "another people" shakes them, albeit painfully, out of their somnabulance.

Actually, a lot could be researched and written on various issues raised by Imran Khan. But my purpose is not to discuss them, for he has taken a lot in his sweep. My concerns are two issues where he has stumbled, namely, "'Allah's Will'" and "dual functions of a Muslim" I would very briefly like to tackle these two issues, according to what I have come to understand is the Quranic view.

In the world of concepts and human communication, words are very important. Twisting the meaning of words while retaining the form makes all the difference. Hence one must be very careful in the choice of words. A whole world view can be changed and distorted. Great revolutions, including that of the Quran, have been thwarted by this method. In Imran Khan's article the term "Allah's Will" is significant. The word "Will" in every day usage denotes emotional fluctuations, indiscriminate change of opinions and decisions, unpredictability, irrationality and unscientific approach towards life. These meanings were attributed to the behavior of *Baghdadi Khalifahs* and the Kings and Shahs who followed them. In the course of time, this image was stamped on to Allah, causing immense damage to Muslim way of life. Now, if we replace the word "Will" with "law" as the Quran enjoins it, the whole perspective changes.